comp

Darse-e-Nakshwar

Centre

سلسلہ مطبوعات اسلامیہ دار الاشاعت نمبر ۱ ۔ دہلی

ہو الباقی

فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ

درس معاشرت

جس میں

نومسلمان گھروں کی صحیح حالت دکھائی گئی ہے

از

جناب حافظ سید عزیز حسن صاحب بقائی پیرزادہ درگاہ حضرت خواجہ
باقی باللہ نور اللہ مرقدہ

حسب فرمایش

جناب مولانا حاجی حافظ عبد المنان صاحب نقشبندی

۱۹۲۸ء

مولوی عبد الحمید خان صاحب نے اپنے

حمیدیہ پریس دہلی میں چھپکر شائع کیا

قیمت ۸ر آنہ

دلِ صد پارہ کے ٹکڑے

بنت فاطمہ رضؓ کے نام

خواہر محترم کشفی بانو صاحبہ اہلیہ جناب مولانا کشفی شاہ صاحب نظامی کو عرصہ سے صنف لطیف کی زبوں حالی کا احساس ہے اور مسلمانوں کی گھریلو زندگی کی خرابیوں کے لئے ان کے دل میں ایک ہوک اٹھتی ہے۔ اور یہ احساس اور یہ درد کیوں نہ ہو کہ سیدہ کشفی بانو خاتون جنت کی پیاری اور باعمل بیٹی ہیں۔ اس لئے میں اپنے ان نو افسانوں کو جو حقیقتاً دل صد پارہ کے ٹکڑے ہیں کشفی بانو صاحبہ کی خدمت میں نہایت خلوص سے پیش کرتا ہوں۔ اور حضرت حق جل مجدہ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ محترمہ کے ذوق عمل اور احساس خدمت صنف لطیف میں اور ترقی دے۔ اور مسلمان خواتین کو اپنے حبیب پاک کے صدقہ میں ہدایت دے کہ وہ اپنی اصلاح اور اپنے شوہروں کی خوشنودی کے لئے جو کہ حقیقتاً خدا اور رسول کی خوشنودی ہے نہایت مستعدی سے تیار ہو کر ان خرابیوں کو دور کرنے میں کوشاں ہوں جس سے آج مسلمانوں کا خانگی نظام درہم برہم کر دیا ہے۔ اور جس کی وجہ سے مسلمانوں کی خانگی مسرت خاک میں مل گئی ہے اور ہزارہا مسلمان گھرانے آج خانگی جھگڑوں کی وجہ سے جہنم کدے بنے ہوئے ہیں۔ وما علینا الا البلاغ۔

خواتین اسلام کا ادنیٰ خدمت گزار

سید عزیز حسن بقائی پیرزادہ درگاہ حضرت خواجہ باقی باللہ رضؓ و مدیر رسالہ پیشوا دہلی

یکم ستمبر ۱۹۳۸ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ

میرے مخلص ترین دوست جناب حافظ سید عزیز حسن صاحب بقائی اولا حضرت خواجہ باقی باللہؒ کی کتابوں کی تصنیف و تالیف کے متعلق جو کوشش ہوتی ہے لاجواب ہوتی ہے سیرت باقی شب عروسی وغیرہ کتابیں ابھی چند ہی روز ہوئے ہیں کہ زیور طبع سے آراستہ ہو کر پبلک سے روشناس ہو چکی ہیں اب آپ نے اپنے چند افسانوں کا ایک مجموعہ جن میں سے بعض آپ ہی کے رسالہ "پیشوا" میں نکل چکے ہیں اور بعض بالکل نورس ہیں چھپوا کر شائع کیا ہے حافظ صاحب کے زور قلم کا لوہا ان کے بہت سے بدخواہ بھی مان چکے ہیں اور حق یہ ہے کہ اپنے مخصوص رنگ میں وہ اپنا نظیر ہی نہیں رکھتے۔ اس سے پہلے ان کے حریفوں کا نہیں بلکہ ان کے دوستوں کا بھی یہی خیال تھا کہ وہ قلمی فوج کے کمانڈر ہیں، مگر اب یہ افسانے لکھکر انہوں نے یہ بھی ثابت کردیا کہ انکی انشاپردازی کا میدان محدود نہیں ہے اور آپ کا اشہب قلم جس میدان میں بھی دوڑتا ہے تو بے حد تیزی سے دوڑتا ہے ان کے عام مضامین میں ایک خطیبانہ جوش، اور ساحرانہ قوت ہوتی ہے جسکا لوہا ہندوستان کے اول درجہ کے لیڈر اور ایڈیٹر مانتے ہی نہیں بلکہ علانیہ اعتراف بھی کر چکے ہیں ان سے بڑے بڑے ایڈیٹر اور نامور لیڈر اس لئے کانپتے ہیں کہ وہ جسوقت نکتہ چینی کرنے بیٹھتے ہیں تو جزئیات پر اس خوبی، روانی اور جوش اور سلاست سے لکھتے چلے جاتے ہیں کہ پڑھنے والے کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اب حافظ صاحب اپنے مخاطب کو مٹا کر ہی چھوڑینگے اور میرے خیال میں ایک ادیب کا یہ انتہائی کمال ہے کہ وہ قارئین پر ایک غیر معمولی مگر ساحرانہ اثر چھوڑے۔

افسانہ نگاری ایک مستقل فن تو ہمیشہ ہی سے تھا لیکن اس زمانے میں تو اس فن نے اسقدر

ترقی کرلی ہے کہ اس کے باقاعدہ قواعد و ضوابط تک مرتب ہوگئے ہیں اور اب کوئی ایسا افسانہ مقبول عام نہیں ہو سکتا جسمیں جدید ترین قواعد کا لحاظ نہ رکھا گیا ہو۔

کسی زمانے میں کہانیاں اور داستانیں بچوںکو اور امراء و سلاطین کو سُلانے کے لیے سنائی جاتی تھیں لیکن آج جو افسانے لکھے جاتے ہیں اُن سے قوم کو جگانا مقصود ہوتا ہے۔ اگلے وقتوں کے قصے اور کہانیاں عام طور پر ایسے بیانات سے پُر ہوتی تھیں جو مافوق العادۃ ہوں اور داستانگو کا کمال فن یہ تھا کہ ان تمام جھوٹی اور ناقابل یقین باتوں کو کچھ اس خوبی اور خوش اسلوبی سے بیان کرے کہ سننے والا اپنی محویت میں شکوک و شبہات کا خیال ہی دلمیں نہ لاسکے لیکن آج جو قصے لکھے جاتے ہیں انکی سب سے بڑی خوبی یہی سمجھی جاتی ہے کہ انمیں کوئی چیز غیر معمولی اور روزمرہ کے واقعات سے الگ نہو لیکن پھر بھی ان واقعات کی ترتیب کچھ ایسی عجیب ہو کہ پڑھنے والے کو ہر چیز انوکھی نظر آئے اور کتاب شروع کرلینے کے بعد ختم ہوئے بغیر اس کے ہاتھ سے نہ چھوٹے۔

بڑے بڑے قصے تو خیر لیکن مختصر افسانے لکھنا اور بھی مشکل ہے تین چار صفحوں کے اندر ایک مکمل قصہ لکھنا جسمیں کچھ واقعات بھی ہوں اور کچھ غیر معمولی دلچسپی بھی کوئی آسان کام نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ میں حافظ صاحب کو انکی اس کامیابی پر کہ انہوں نے بہت سے مختصر افسانے لکھ ڈالے اور سب کے سب نہایت اچھے بھی لکھے، دل سے داد دیتا ہوں۔ کیونکہ ان افسانوں میں لٹریری خوبیوں کے علاوہ مسلمانوں کے خانگی نظام کی خرابیوں کو دل کھول کر بیان کر دیا گیا ہے۔

اس کتاب میں جتنے افسانے جمع کیے گئے ہیں ان سب کا ایک مقصد ہے اور وہ درحقیقت قوم کو بیدار کرنے ہی کی غرض سے لکھے گئے ہیں ہر افسانے میں ایک نہایت مفید سبق ہے اور ہر داستانمیں بحد کافی اخلاقی تعلیم ہے، اور انہیں سے ہر ایک قصہ ایسا ہے جسے بچوں کو بھی سنایا جاسکتا ہے اور بیویوں بہنوں اور بیٹیوں کو بھی اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ یہ کتاب چند اخلاقی سبقوں کا ایک ایسا دلچسپ مجموعہ ہے جسے پڑھنے کو خواہ مخواہ ہر شخص کا جی چاہے اور ایسی نصیحت ہے جسکا نام "داروئے تلخ" کی بجائے "شہد خالص" زیادہ موزوں ہوگا میری دعا ہے کہ یہ کتاب امید سے زیادہ مقبولیت حاصل کرے اور بہت سے ہموطنوں اور ہمقوموں کی اصلاح کا ذریعہ بنے۔

یکم ستمبر ۲۸ء دہلی

خاکسار۔ عبدالحمید مدیر درویش و مولوی

عالی ہمت نوجوان

منشی اکرام اللہ ابھی سو کر اٹھے تھے کہ دروازہ پر کسی نے آواز دی۔ باہر نکلے تو دیکھا کہ اُن کے پُرانے دوست فضل محمد خاں صاحب ہیں۔ فضل محمد خاں صاحب ایک پرانی وضع کے بزرگ تھے۔ عمر بھی پچاس سے اوپر ہو چکی تھی مگر کاٹھی اچھی تھی اس لئے کچھ ایسے بوڑھے نہیں معلوم ہوتے تھے۔ ڈاڑھی نصف سے زیادہ سفید ہو چکی تھی اور یہی حال سر کے بالوں کا تھا۔ خانصاحب ان لوگوں میں سے تھے جو ایک مرتبہ کسی وضع کو اختیار کر کے پھر تادم مرگ تبدیل نہیں کرتے یہی وجہ تھی کہ اب بھی ان کے جسم پر کوٹ یا شیروانی کی بجائے وہی پرانی وضع کی اچکن تھی۔ سر پہ اونچی باڑھ کی گول ٹوپی تھی جس پر تقریباً دو انچ چوڑی سنہری لیس لگی ہوئی تھی۔ گھٹنوں کے بال تھے جن میں نہایت عمدہ قسم کا چنبیلی کا تیل پڑا ہوا تھا۔ ڈاڑھی دونوں طرف گالوں کے اوپر چڑھی ہوئی تھی اور چونکہ چہرہ کسی قدر بھاری تھا اس لئے وہ بہت ہی اچھی اور بارعب معلوم ہوتی تھی۔ آنکھوں میں ہلکی سی سرمہ کی تحریر تھی۔ پان کھائے ہوئے تھے۔ اور کندھے پر ایک بڑا سا رومال پڑا تھا۔ ڈھیلے پائنچوں کا پائجامہ اور دہلی کی سلیم شاہی جوتی نے اس وضع کو اور بھی شاندار بنا دیا تھا۔ جو خانصاحب نے اختیار کر رکھی تھی اور جو چند روز پیشتر ہندوستان کے تمام شرفا کی وضع تھی۔

معمولی سلام دعا کے بعد منشی اکرام اللہ نے پوچھا کہ اس قدر صبح ہی صبح آنے کا باعث کیا تھا۔

خانصاحب:۔ بیٹھک کھولو۔ آدمیوں کی طرح بیٹھو تو کچھ بتاؤں۔ دروازے پر کھڑے کھڑے تو مجھ سے کچھ کہا نہیں جاتا۔

منشی جی نے تعمیل حکم کی اور جب خانصاحب بہ اطمینان تمام بیٹھ گئے تو کہا:-

خانصاحب:- بھئی اکرام بات اصل یہ ہے کہ کل سے میں سخت متفکر ہوں اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔

اکرام:- (پریشان ہوکر) کیوں خیر تو ہے۔ کیا بات ہے؟

خانصاحب:- بات کیا ہے۔ میاں فضل احمد کی شادی کی بات ہے۔ عید کے چاند ان کی برات ہے اور اب شب برات ختم کے قریب ہے صرف مہینہ سوا مہینہ باقی ہے اور میرے یہاں ابھی کسی قسم کی بھی تیاری نہیں ہوئی کیونکہ ابھی تک کہیں سے روپے کا کوئی انتظام نہیں ہوسکا۔ اور اب میں سخت پریشان ہوں کہ کیا ہوگا۔

اکرام:- بھئی فضل محمد میں تو اس جھوٹی ٹیمٹام اور نمائش کا قائل نہیں ہوں جس کے تم دلدادہ ہو۔ آدمی کے پاس روپیہ ہو تب بھی اسے فضول خرچی نہیں کرنی چاہیئے نہ کہ تم محض دنیا دکھاوے کی خاطر قرض لینے کے لئے بے قرار ہو۔

خانصاحب:- (مسکرا کر) اب میں تمہاری طرح بے غیرت کسطرح ہوجاؤں تمام عمر لوگوں کو اچھی طرح کھلاتے پلاتے اور دیتے لیتے گذری ہے اب بیٹے کے بیاہ پر کچھ خرچ نہ کروں گا تو دنیا کیا کہے گی؟

اکرام:- دنیا کو ڈالو جہنم میں۔ تھوڑی سی تو تمہاری جائداد ہے۔ اس پر تم کئی ہزار روپے پہلے ہی قرض لے چکے ہو۔ اب اگر اور قرض لوگے تو ساری جائداد اسی کی نذر ہو جائے گی۔

خانصاحب:- (ٹھنڈا سانس بھر کر) جائداد تو بھائی اکرام اب گئی سمجھو۔ سولہ ہزار اس پر قرض ہو چکا ہے۔ اور اب دس ہزار اسی پہ اور لینا ہے۔ بظاہر کوئی ایسی صورت نظر بھی نہیں آتی کہ یہ قرض اُتر جائے۔

اکرام:- تو اب ذرا تمہیں سوچو کہ اس سے بڑھکر اور حماقت کیا ہوگی کہ جو ایک ذریعہ

تمہاری آمدنی کا ہے اور جس سے تمہارے گھر کا سارا خرچ چل رہا ہے اسی کو تم تباہ کئے دیتے ہو۔

خانصاحب :۔ تو پھر آخر کیا کروں۔ تم کہیں اور سے روپیہ دلوا دو جہاں جائداد رہن نہ رکھنی پڑے۔

اکرام :۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ تمہیں قرض لینا ہی نہیں چاہیئے۔

خانصاحب :۔ منہ سے کہدینا بہت آسان ہے۔ تمام کنبے میں ناک کٹ جائیگی۔

اکرام :۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ قرضدار کے منہ پر ناک ہوتی ہی نہیں۔ جو کٹے۔ ناک تو تم اسی روز کٹوا چکے تھے جس روز تم نے پہلی مرتبہ اس جائداد پر قرض لیا تھا۔ کیا جس بنئے سے تم نے قرض لیا تھا اسے تمہاری مالی حالت کا علم نہیں ہوگیا۔ اور کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ یہ بات سب سے چھپی ہوئی ہے کہ تم اس قدر مقروض ہو۔ جب لوگوں کو یہ معلوم ہو چکا ہے کہ تم غریب ہو تو پھر اب موم کی ناک لگا کر ان کے سامنے جانے سے کیا فائدہ۔

خانصاحب :۔ پھر بھی بھائی اکرام ظاہر میں تو ایک بھرم بنا ہوا ہے۔ لوگ جھک جھک کر خانصاحب کو سلام تو کہتے ہیں۔ جائداد پر قبضہ تو میرا ہی ہے۔ ایسی حالت میں یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ میں چپ چپاتے بیٹے کا بیاہ کر دوں اور اگر میں تمہارا کہنا مان بھی لوں تو بھلا تمہاری بھاوج مان جاوینگی۔ ان کا اکلوتا بیٹا ہے۔ ہزاروں دعاؤں اور منتوں کے بعد خدا نے یہ دن دکھایا ہے۔ لاکھوں ارمان دل میں بھرے پڑے ہیں انہیں اگر یہ معلوم ہوا کہ میں "شرعی شادی" کر رہا ہوں تو وہ رو رو کے اپنا خون کر لیں گی۔

اکرام :۔ جس طرح اپنی حالت کو تم سمجھ سکتے ہو اسی طرح وہ بھی سمجھ سکتی ہیں اور اگر وہ سمجھنا نہیں چاہتیں تو ان سے بڑھکر بے وقوف اور کون ہو سکتا ہے۔

خانصاحب۔ خیر بھئی یہ باتیں تو ہوا ہی کریں گی مگر اب تم چل کر ذرا کندن لال ساہوکار سے سود کا نرخ توڑ کرا دو۔

اکرام:۔ بھئی فضل محمد مجھ سے تو یہ ہرگز نہ ہو سکے گا کہ اپنی معرفت اپنے دوست کی تباہی کا سامان مہیا کروں۔ میں ہر قسم کی خدمت کے لئے تیار ہوں مگر یہ تو مجھ سے نہ ہو سکے گا۔

خانصاحب:۔ (کسی قدر کھسیانے ہو کر) تو تم سچ مچ نہیں چلو گے۔

اکرام:۔ نہیں اس کام کے لئے تو نہیں جاؤں گا۔ اور جو خدمت کہو حاضر ہوں

٭

فضل احمد کی شادی کو اب تیسرا سال ہے لیکن جیسا کچھ دھوم دھڑکا اس میں ہوا تھا وہ آج تک لوگوں کو یاد ہے جہاں کہیں شادی بیاہ کا ذکر آتا ہے وہاں لوگ فضل احمد کی شادی کو مثال کے طور پر پیش کرتے ہیں خانصاحب بہت خوش اور بشاش ہیں اور ان کی بیگم صاحبہ بھی لیکن قضائے الہی ایک روز خانصاحب گاؤں سے واپس آتے وقت بارش میں بھیگ گئے اور خوب سردی کھائی۔ بڈھے آدمی اس پر سردی کا اثر گردوں پہ ورم ہو گیا اور کچھ ایسی گھڑی سے پڑے کہ ایک ہی مہینہ میں اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

ابھی تک تو باپ کی موجودگی کی وجہ سے فضل احمد کو اپنی بیوی کی ناز برداریوں کے سوا اور کوئی کام نہ تھا لیکن اب باپ کی وفات نے تمام گھر کا بوجھ اس کے سر پڑ ڈال دیا۔ تجہیز و تکفین سے فرصت پا کر اس نے حساب کتاب دیکھنا چاہا تو اسے معلوم ہوا کہ اس کا خاندان افلاس و ادبار کے غار کے کنارے سو رہا ہے اور صرف ایک کروٹ لینی باقی ہے۔ جائداد کی کل قیمت پینسٹھ ہزار سے زیادہ نہ تھی اور اب سود ملا کر اس پر ساٹھ ہزار سے کچھ اوپر قرض ہو گیا۔ آمدنی بس اتنی ہی تھی کہ

اس سے گھر کا کام چلتا رہتا تھا اور اتنا کبھی خانصاحب کو نصیب نہ ہوا تھا کہ اگر اصل میں کچھ نہ دیں تو قرضہ کا سود ہی سال بسال ادا کرتے رہیں۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور گھنٹوں بیٹھا یہی سوچتا رہا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ فضل احمد ایک بہت ہی باہمت اور غیور نوجوان تھا۔ تعلیم اگرچہ بہت اچھی نہیں ہوئی تھی لیکن جاہل بھی نہ تھا اس کی سمجھ میں جب کچھ نہ آیا تو اس نے تمام حالات سے ماں کو آگاہ کیا۔ لیکن اس سے زیادہ وہ بھی کچھ نہ کر سکیں کہ دو ایک وقت رنج کی وجہ سے کھانا نہ کھایا۔ اور کمزوری کی وجہ سے دو ایک دورے غشی کے بھی لاحق ہو گئے۔ فضل احمد کو یکایک منشی اکرام اللہ کا خیال آیا۔ اور وہ ان کے پاس پہنچا۔ اور ان کو سب حالات سے آگاہ کر کے بولا:۔

فضل:۔ چچا صاحب میں تو تباہ ہو گیا۔ خدا کے لئے کوئی صورت نکالئے۔

اکرام:۔ (آبدیدہ ہو کر) بیٹا میں نے تو تمہارے والد مرحوم کو بہت کچھ سمجھایا مگر انہوں نے ایک نہ مانی اور اپنی ہی خوشی کی۔

فضل:۔ مگر چچا اب کیا ہو؟

اکرام:۔ صرف دو صورتیں ہیں۔ تم اپنے گھر میں تین آدمی ہو اور اگر فضول خرچی نہ کیجائے تو چالیس پچاس روپے مہینے میں تم بہت اچھی طرح گذارہ کر سکتے ہو۔ یا تم یہ کرو کہ اتنی آمدنی کی کوئی ملازمت کر لو۔ اور جائداد کی جتنی آمدنی ہے وہ سب کی سب سال کے سال قرض میں ادا کرتے رہو یا پھر یہ کہ جائداد کو فروخت کر کے قرضہ چکا دو اور جتنا روپیہ باقی بچے اس سے کوئی تجارتی کاروبار شروع کر دو۔ خود نہایت محنت اور تندہی سے کام کرو اور گھر والوں پر کفایت شعاری سے خرچ کرنے کی تاکید کرو اور اس اصول کو کبھی مت بھولو۔ کہ اگر تمہاری آمدنی صرف ایک روپیہ مہینے کی ہے تو تمہارا خرچ کسی حالت میں بھی چودہ آنے سے زیادہ نہ ہونا چاہیئے۔ جب کبھی اس اصول کو توڑ کر تم پندرہ آنے بھی خرچ کر دو گے تو نقصان ہونا لازمی ہے۔ جو تمہاری تباہی کا

پیش خیمہ ہے۔

فضل احمد نے دوسری صورت کو ترجیح دی اور قرض ادا کرکے جو کچھ بچ رہا اس سے کپڑے کی تجارت شروع کردی بازار میں سب سے پہلے دوکان کھولنے اور سب سے بعد میں بند کرنے کے لئے اس کی دوکان کی شہرت ہوگئی۔ معاملہ کی صفائی اور تھوڑے منافع پر زیادہ فروخت کرنے کے اصول نے تھوڑے ہی دنوں میں اس کی دوکان چمکادی، اور اب اس کی آمدنی اوسطاً تین سو روپے ماہوار ہے لیکن وہ اس اصول پر آج بھی کاربند ہے کہ

ایک روپے کی آمدنی ہو تو خرچ صرف چودہ آنے ہونا چاہیئے



گرہن کے کھلونے

قاضی سید عبدالرشید مرحوم بلند شہر کے ایک معمولی اور غریب باشندے تھے اور یہ واقعہ ہے کہ اگر ان کی خلقی خرابیٔ دماغ نے ان کے پستول کا نشانہ سوامی شردہانند کو نہ بنایا ہوتا تو ملک، صوبہ اور شہر تو کجا، خود ان کے اہل محلہ میں سے بھی اکثر ان سے ناآشنا اور ناواقف رہتے۔ قاضی صاحب خوشنویس تھے اور مختلف اخبارات و رسائل میں کتابت کر کے اتنا کما لیتے تھے کہ بمشکل اپنا اور اپنے متعلقین کا پیٹ پال سکیں۔ شہر میں جس کسی کا بھی ان سے واسطہ پڑا ہے وہ اگرچہ انہیں مجنون یا دیوانہ کہنے کے لئے تیار نہ ہو لیکن یہ ضرور کہتا ہے کہ ان کے دماغ میں کوئی نہ کوئی خرابی ایسی ضرور موجود تھی جو عام طور پر انسانی دماغوں میں نہیں ہوتی اور جس کی وجہ سے قاضی صاحب بسا اوقات کچھ ایسی حرکتیں کر بیٹھتے تھے کہ ان سے کام والا یہ عہد کرنے پر مجبور ہوتا تھا کہ وہ آئندہ ان سے کام نہ لے گا۔ ان کی کاپی نویسی کے متعلق بہت سے دلچسپ قصے مشہور ہیں، اور گو ان میں سے کوئی ایک قصہ بھی انہیں پاگل ثابت کرنے کے لئے کافی نہ ہو لیکن بحیثیت مجموعی وہ ان کے دماغ کا ایک ایسا غیر معمولی کارنامہ ضرور ہیں جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا بیوی اور بچوں کے ساتھ یا اپنے بعض احباب کے ساتھ بھی انہوں نے بہت سے برتاؤ ایسے کئے تھے جنہیں صرف ایسی حالت میں برداشت کیا جا سکتا ہے کہ جب یہ سمجھ لیا جائے کہ برتاؤ کرنے والا اگر مجنون نہیں تو نیم مجنون ضرور ہے، اور ان کے اہل محلہ میں یہ بات مشہور رہے کہ اگر محلہ والوں نے بروقت مدد نہ کی ہوتی، اور ان کے گھر میں گھس کر انکی بیوی کو نہ بچایا ہوتا تو وہ نیک بندی نہ معلوم کب کی اس خرابیٔ دماغ پر قربان ہو چکی ہوتی۔ یہ بالکل سچ ہے کہ انہیں کوئی شخص بھی پاگل نہیں کہتا تھا لیکن یہ بھی اسی قدر

سچ ہے کہ ان کی دماغی حالت کی طرف سے ان کا کوئی دوست یا عزیز مطمئن بھی نہ تھا اور یہی وجہ تھی کہ آہستہ آہستہ سب لوگوں نے ان سے تعلقات کم کردیئے تھے اور جب سوامی شردہانند کے الزام قتل میں انھوں نے اپنی دماغی خرابی کا آخری مظاہرہ لوگوں کے سامنے پیش کیا ہے تو ان کے دوستوں کی تعداد شاید بمشکل ایک دو ہوگی۔

سوامی شردہانند جی کو اگرچہ ان کے آخری زمانہ میں انکی اپنی بعض مخالفانہ سرگرمیوں کے باعث مسلمانوں میں وہ ہر دلعزیزی حاصل نہ رہی تھی جو تحریک ترک موالات کے دوران میں انھوں نے اپنی دلیرانہ قیادت کی بدولت حاصل کرلی تھی لیکن پھر بھی یہ بات کسی مسلمان کے وہم وگمان میں بھی نہ آسکتی تھی کہ ایک ستر یا بہتر برس کے ضعیف العمر انسان کو قتل کرکے ہندوؤں کی ان مخالفانہ اور مخاصمانہ کارروائیوں کا بدلہ لیا جائے جو ہندوستان کے اکثر مقامات پر ظاہر ہوچکی تھیں اور یہی وجہ تھی کہ جب یہ خبر مشہور ہوئی کہ قاضی عبدالرشید نے سوامی جی کو قتل کردیا تو ہندوؤں سے زیادہ مسلمان حیرت میں رہ گئے اور پشاور سے لے کر راس کماری تک اور کراچی سے لے کر کلکتہ تک ہر مسلمان رہنما اور مسلمان اخبار نے اس واقعہ پر افسوس کیا اور قاتل کے فعل سے نفرت اور بیزاری کا اظہار کیا۔ مسلمانوں میں ایسا کامل اتفاق رائے اور اتحاد خیال شاید کبھی کسی معاملہ میں نہ دیکھا گیا ہوگا کہ جیسا سوامی جی کے حادثۂ قتل پر اظہار افسوس اور قاضی عبدالرشید کی اس حرکت پر اظہار نفرین کی صورتیں دیکھا گیا۔ ہر فرقہ اور ہر طبقہ کے مسلمان اس فعل کو برا کہہ رہے تھے اور یہی نہیں کہ دنیا دکھاوے کے لئے رہنما ایسا کہہ رہے ہوں بلکہ درحقیقت ان کے دلوں میں بھی مقتول کی ہمدردی اور قاتل سے نفرت و بیزاری کے جذبات موجزن تھے۔

آریہ سماج کو اس حرکت پر غصہ آنا ایک طبعی اور قدرتی بات تھی چنانچہ غصہ آیا اور اچھی طرح آیا اور اب جس جس طریقہ پر ان کے رہنماؤں نے اور ان کے اخبارات نے

اپنے فرقہ میں مسلمانوں کے خلاف نفرت پھیلائی وہ بھی یقیناً ایک اسی قدر مجنونانہ فعل تھا جیساکہ قاضی عبدالرشید کا اور ان دونوں مجنونانہ حرکتوں میں کچھ فرق تھا تو صرف یہ کہ قاضی سید عبدالرشید کے جنون میں کسی قسم کا تصنع نہ تھا اور سنگھٹنی سورماؤں کا جنون بالکل اختیاری اور خودساختہ تھا۔ مسلمانوں کا تمام اظہار افسوس، اور قاتل کے اس فعل سے عالمگیر بیزاری کسی طرح بھی آریہ سماجی غصہ کو دور نہ کرسکی اور چڑھا جن نہ اترنا تھا اور نہ اترا۔ اور آریہ سماج کے آرگن تیج نے اس قتل کو اشارتاً حضرت خواجہ حسن نظامی کی سازش سے منسوب کرکے مسلمانوں کو مزید اشتعال دلایا۔

مسلمان حق پسند بھی ہیں حق گو بھی، اور قتل و غارت سے بالطبع متنفر بھی ہیں لیکن ان تمام اوصاف کے باوجود وہ اس بات پر ہرگز قادر نہیں ہیں کہ ان کی تحقیر و تذلیل کیجائے اور وہ اسے بالکل محسوس ہی نہ کریں۔ ان کے ایک رہنما نے کانگریس کے پنڈال میں کھڑے ہوکر سوامی جی کی جان کے بدلے میں خوشی سے اپنی جان پیش کی، ان کے علماء نے قاضی عبدالرشید کے بیان کردہ فعل پر اظہار افسوس کیا، اور ان کے اخبارات نے بلا استثنا اس حادثہ پر انتہائی افسوس کا اظہار کیا لیکن اس کے جواب میں آریہ سماج کی مخاصمانہ ذہنیت نے اس واقعہ کو ایک فرضی سازش کا نتیجہ قرار دیا، مسلمان علماء اور رہنما جھوٹے ٹھیرائے گئے، اور اخبارات کا اظہار رنج ناقابل التفات قرار پایا۔ یہ تذلیل و تحقیر آسانی سے برداشت نہ ہوسکتی تھی اور اس طرح آریہ اخبارات کی زہر بھری تحریرات نے آہستہ آہستہ عام مسلمانوں کی رائے کو سوامی جی کی طرف سے ہٹا کر اب قاضی عبدالرشید کیطرف منتقل کرنا شروع کردیا۔

خود مسلمان اگر بے انتہا کوشش کرتے تب بھی عام مسلمانوں کو قاضی عبدالرشید کے ساتھ ہرگز ہرگز اتنی ہمدردی نہ پیدا ہوتی جتنی آریہ اخبارات کی روزمرہ کی سب وشتم نے اور مسلمانوں کے سچے جذبات کی تحقیر نے بہت ہی تھوڑے سے عرصہ میں پیدا کردی، اور

اس طرح وہ جوش وہنگامہ رونما ہوا جو قاضی عبدالرشید کے پھانسی پر چڑھائے جانے کے دن ۱۴ نومبر ۲۷ء کو دیکھنے میں آیا اور جس کی تمام تر ذمہ داری آریہ اخبارات کے اشتعال انگیز رویہ پر ہے۔

مسلمان عوام جو اب آریہ اخبارات کی دلخراش تحریرات کی بدولت عبدالرشید کو کسی نہ کسی حد تک ایک "ہیرو" خیال کرنے لگے تھے جوق درجوق دہلی ڈسٹرکٹ جیل کے سامنے جمع ہونے شروع ہوئے اور تھوڑی دیر میں ایک اچھا خاصا چالیس پچاس ہزار آدمیوں کا مجمع ہوگیا۔ پولیس نے پھانسی سے پہلے ہی شب میں قاضی صاحب کے رشتہ داروں سے یہ طے کرلیا تھا کہ جب لاش انہیں دیجائے گی تو وہ اسے براہ راست قبرستان میں لیجائیں گے جو جیل کے سامنے واقع ہے۔ پھانسی اگرچہ علی الصباح ہوچکی تھی لیکن خدا جانے کس مصلحت کی بنا پر حکام نے لاش دینے میں اس قدر دیر کی کہ دس بج گئے اور قدرتی طور پر انتظار کے ساتھ مجمع کا جوش بڑھتا گیا اور بعض مفسدوں کو جن کا مقصد لوگوں میں اشتعال پیدا کرنا تھا اس بات کا موقعہ مل گیا کہ مجمع میں سے چند آدمیوں کو اپنا ہم خیال بنالیں۔

یہ واقعہ ہے کہ لاش عبدالرشید کے اعزا کو دیگئی اور یہ بھی واقعہ ہے کہ قبل اس کے کہ کسی کو معلوم بھی ہوسکے کہ کیا ہوا چند مفسدوں نے کندھا دینے کے بہانے سے لاش کو لیا اور اس تیزی سے شہر کی جانب لے کر چل دیئے کہ پولیس کو اور عبدالرشید کے اعزا کو جب یہ معلوم ہوا کہ لاش شہر کی جانب گئی ہے اس وقت وہ دلی دروازہ کے قریب پہنچ چکی تھی اور جب تک وہ دلی دروازہ پہونچے لاش جامع مسجد پر تھی، آگے آگے لاش اور پیچھے پیچھے مجمع اور پولیس، اسی طرح بھاگم بھاگ لاش جیل سے تقریباً ڈیڑھ میل تک چلی گئی اور اس پندرہ بیس ہزار کے مجمع میں شاید زیادہ سے زیادہ پانچسو ایسے آدمی ہوں گے جنہوں نے لاش کی صورت دیکھی ہو اور بمشکل پچاس ایسے کہ جنہوں نے اسے کندھا دیا ہو۔

جیل کے سامنے جو مجمع تھا اس میں بہت سے نیک اور شریف آدمی بھی تھے اور جب

انہوں نے دیکھا کہ بعض فتنہ پردازوں کا قابو چل گیا ہے اور قانون کے خلاف کارروائی ہو رہی ہے تو وہ مختلف راستوں سے اپنے اپنے گھروں کو چل دیئے اور انہی کے پیچھے اور بھی ہزاروں آدمی لاش لے جانے والوں کو بُرا بھلا کہتے لوٹ آئے۔ فوج اور پولیس نے جب لاش کو قطب روڈ پر روکا ہے تو جنازہ کے ساتھ چند آدمی تو فی الحقیقت وہی تھے جو اس شر و فساد کے بانی تھے لیکن زیادہ تعداد اُن تماشائیوں کی تھی جو راہگیروں کے طور پر اس سڑک پر موجود تھے یا آس پاس کی دوکانوں سے اُٹھ اُٹھ کر آ گئے تھے۔

بدقسمتی سے جب یہ اتنا بڑا مجمع چاوڑی بازار سے گذر رہا تھا تو شریر ہندوؤں نے لاش پر پتھر پھینکے اور مسلمانوں کو مشتعل کرنے کی کوشش کی۔ اور قصداً یا بلاقصد چند ہندوؤں کی دوکانوں کا کچھ سامان سڑک پر گر گیا۔ اور کئی ایک ہندو مجروح بھی ہو گئے تھے جن میں سے ایک وہیں مر بھی گیا۔ پولیس نے حسب معمول نہایت شد و مد کے ساتھ گرفتاریاں کیں اور بے گناہ اور گناہگار کی تفریق ایسے موقع پر نہ ہو سکتی تھی اور نہ ہوئی۔ سڑک پر جو کوئی بھی موجود تھا وہ تو لائق تعذیر سمجھا گیا لیکن سڑک سے علیحدہ بھی قرب و جوار کے مقامات سے پولیس نے جسے چاہا اُسے گرفتار کر لیا اور اس طرح چند بدمعاشوں کے ہاتھوں ایک طرف تو ایک مسلمان کی لاش کی توہین ہوئی اور دوسری طرف صدہا بے گناہ پولیس کی حراست میں پہونچ گئے۔

٭٭٭

عبدالقادر اور عبدالخالق دونوں بھائی تھانہ بھون کے رہنے والے تھے اور ایک عرصۂ دراز تک سرکاری فوج میں نوکری کرنے کے بعد دونوں کے دونوں اپنی بعض خانگی ضرورتوں سے مجبور ہو کر استعفے دیکر چلے آئے تھے۔ ملازمت کے زمانہ میں بھی اگرچہ ان کی قلیل تنخواہیں اتنی نہ تھیں کہ وہ بہ فراغت بسر کر سکیں لیکن اب استعفے دینے کے بعد تو وہ سہارا بھی جاتا رہا اور تھانہ بھون پہنچکر دونوں کو سب سے پہلے یہ فکر لاحق ہوئی کہ حصول معاش کے لئے کیا ذرائع اختیار کیے جائیں۔ بہت کچھ غور و فکر کے بعد یہ طے پایا کہ کپڑے کی دوکان کھولیجائے

اور اس کے لئے دونوں نے اپنی اپنی بیویوں اور لڑکیوں کا زیور فروخت کر کے روپیہ مہیا کیا۔ کچھ تھوڑا سا نقد روپیہ دونوں کے پاس موجود تھا' کچھ زیورات سے حاصل کیا اور کچھ قرض لے کر انہوں نے دو ہزار کی رقم پوری کی اور دہلی روانہ ہو گئے تاکہ وہاں سے مال خرید کر جلد سے جلد اپنی تجارت شروع کر سکیں۔ گھر سے رخصت ہوتے وقت دونوں چھوٹی لڑکیاں اپنے اپنے باپوں کو لپٹ گئیں اور تتلا تتلا کر کھلونوں' مٹھائیوں' اور اوڑھنیوں کی فرمائشوں کی بھرمار کر دی۔ عبدالقادر اور عبدالخالق نے بچوں کو پیار کیا' بہت سی چیزیں ان کے لئے لانے کے وعدے کئے اور شام کی گاڑی سے روانہ ہونے کی نیت سے قریب کے ریلوے اسٹیشن کو روانہ ہو گئے۔ گیارہ بجے کے قریب گاڑی دہلی پہنچی اور دونوں بھائی بہت ہی خوش خوش اور امیدوں سے بھرے ہوئے دل لئے سب سے پہلے تو جامع مسجد دیکھنے گئے اور وہاں سے فارغ ہو کر قریب کی ایک دوکان میں کھانا کھانے بیٹھ گئے۔

دوکان پر قاضی عبدالرشید صاحب کے جنازہ کا ذکر ہو رہا تھا جسے انہوں نے بغور سنا اور ان مسلمانوں کی حماقت پر افسوس کرتے ہوئے صدر بازار کی جانب روانہ ہوئے۔ گھنٹہ گھر' چاندنی چوک' اور کھاری باؤلی کی سیر کرتے ہوئے دونوں بھائی خراماں خراماں قطب روڈ تک پہونچے ہی تھے کہ انہوں نے دیکھا کہ فوج نے قاضی صاحب کے جنازہ کو روک لیا ہے اور موٹر لاری میں رکھکر اسے واپس لے جانے کا ارادہ کر رہی ہے۔ کچھ تو جنازہ کا اس طرح موٹر میں لادا جانا ان کے لئے ایک عبرتناک منظر تھا اور انہیں چلتے چلتے روک کر کھڑا کر لینے کے لئے بالکل کافی اور کچھ اس پر طرہ یہ ہوا کہ فوج کو مصروف کار دیکھکر انہیں اپنی فوجی ملازمت کا زمانہ یاد آ گیا اور وہ اس دل خوش کن ماضی کی سیر میں محو ہو گئے کہ جب وردی پہنکر قدم ملائے ہوئے وہ بازار میں سے سینہ تانے نکلا کرتے تھے اور شہر کے لوگ دور دور یہ صفیں باندھکر ان کی فوجی وردیوں اور چمکتی ہوئی سنگینوں کو خوف کی نگاہوں سے دیکھا کرتے تھے۔ ابھی وہ دونوں انہی خیالات میں منہمک تھے کہ یکایک ایک پولیس والے

نے آکر انہیں بھی اور لوگوں کی طرح گرفتار کرلیا۔ عبدالقادر نے حیران ہوکر عبدالخالق کی طرف دیکھا اور عبدالخالق نے عبدالقادر کی طرف اور تھوڑی دیر تک دونوں میں سے کوئی بھی یہ نہ سمجھ سکا کہ کیا معاملہ ہے۔ بالآخر انہیں کچھ ہوش سا آیا اور انہوں نے پولیس والے سے پوچھا کہ کیا معاملہ ہے۔

کانسٹبل۔ سب آدمیوں کو بلوہ میں گرفتار کیا گیا ہے۔

عبدالقادر۔ بھائی ہم تو پردیسی ہیں مال خریدنے آج ہی تھانہ بھون سے آئے ہیں۔ ہمیں تو معلوم بھی نہیں کہ کیسا بلوہ ہے (جیب سے نوٹ نکالکر) دیکھو یہ روپے ہیں صدر بازار سے مال لینے جارہے ہیں

کانسٹبل۔ ہمکو کچھ معلوم نہیں جی۔ بس چپکے چلے چلو۔

کشاں کشاں دونوں بھائی گردن جھکائے کانسٹبل کے ساتھ ہولئے اور حوالات میں بند کردیئے گئے۔ دونوں نوگرفتار اور ناتجربہ کار گردن جھکائے عالم مایوسی میں ایک طرف حوالات کی کوٹھڑی میں بیٹھے ہوئے تھے کہ یکایک ان کی طلبی ہوئی اور کوتوال صاحب نے ان کے بیانات لئے۔ دونوں نے وہی بیان دیا جو کانسٹبل کے سامنے دیا تھا اور اب پھر کوتوال صاحب کو یقین دلانے کے لئے اور یہ ثابت کرنے کے لئے کہ بلوہ میں شریک ہونے کے واسطے کوئی گھر سے نوٹ اور روپے باندھکر نہیں نکلا کرتا عبدالقادر نے پھر جیب میں ہاتھ ڈالا کہ نوٹ نکالے مگر اس کی سراسیمگی کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ جیب خالی ہے اور نوٹوں کا کہیں پتہ نہیں۔ اس نے گھبراکر چھوٹے بھائی سے پوچھا اور تھوڑی دیر کے لئے دونوں یہ بھی بھول گئے کہ وہ حراست میں ہیں اس تازہ مصیبت نے بالکل ان کے اوسان کھودیئے اور انہوں نے بہت ہی بھرائی ہوئی آواز میں کوتوال صاحب سے کہا کہ ہماری جیب میں سے کسی نے نوٹ نکال لئے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ گرفتاری کے وقت انہوں نے کانسٹبل کو وہ نوٹ دکھائے تھے لیکن جب کوتوال صاحب نے بلاکر اس کانسٹبل سے

پوچھا تو اس نے اس واقعہ سے صاف انکار کیا اور کہا کہ مجھے تو کسی نے بھی نوٹ نہیں دکھائے کانسٹیبل سچا اور وہ دونوں جھوٹے ٹھیرے، اور ان کے اس بیان کو ایک فرضی افسانہ اور ایک من گھڑت بہانہ قرار دیدیا گیا۔ پولیس کا جو عہدہ دار آتا اور اس قصہ کو سنتا وہی دونوں غریبوں کو دو چار گالیاں اس عذر پر سنا دیتا کہ انہوں نے پولیس کو بدنام کرنے کے لئے ایسا جھوٹا قصہ گھڑا تھا۔

شہر کے لوگوں کے لئے دوڑ دھوپ کرنے والے موجود تھے ان سب کی ضمانتیں ہو گئیں اور انہیں حوالات سے رہائی مل گئی مگر ان دو دکھیاروں کی کوئی بھی خبر لینے والا نہ تھا اور انہیں اس وقت تک حوالات کی مصیبت بھگتنی پڑی کہ جب تک خدام المسلمین کی ڈیفنس کمیٹی نے ازراہ خدا ترسی ان کی ضمانت کا انتظام نہ کر دیا۔

حوالات سے نکلکر بڑے بھائی نے کہا:۔

عبدالقادر۔ اس سے تو حوالات ہی میں اچھے تھے۔ کچھ نہ کچھ پیٹ میں تو پڑ جاتا تھا

عبدالخالق۔ بھیا آخر یہ کیا ہو گیا۔ حوالات سے اگر ہم چھٹ بھی گئے تو اس مقدمہ سے کسطرح رہائی ہوگی اور ہمارا روپیہ ——————— اتنا کہکر عبدالخالق کا دل بھر آیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ بڑے بھائی نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی لیکن خود اپنی طبیعت کو قابو میں نہ رکھ سکا اور نتیجہ یہ ہوا کہ بہت دیر تک دونوں بھائی ایک دوسرے کے گلے سے لگ کر زار وقطار روئے۔ رونے سے کچھ دل ہلکا ہوا تو انہوں نے اپنے متعلق کچھ تدابیر سوچیں اور دو ایک روز محنت مزدوری کر کے ریل کے کرایہ کے لائق دام جمع کئے اور اپنے گھر چلے گئے۔

جس وقت یہ دونوں تھانہ بھون پہونچے ہیں تو اتفاق سے عبدالخالق کی چھوٹی بچی باہر کھیل رہی تھی۔ دور سے اس نے جو باپ کو آتے دیکھا تو دوڑتی ہوئی پہلے تو گھر میں گئی اور سب کو ان کی آمد کی اطلاع دی اور پھر عبدالقادر کی لڑکی کو ساتھ لیکر

دوڑتی ہوئی آئی اور باپ کی ٹانگوں میں لپٹ گئی۔ دونوں نے اپنی اپنی بچیوں کو اٹھا کر گود میں لیا اور پیار کرنے لگے۔ ایک بولی کہ ابا جی ہمارے لئے مٹھائی لائے؟ دوسری نے تقاضہ کیا کہ ابا جی ہمارے کھلونے کہاں ہیں؟

دُکھے ہوئے دل اسپر معصوم بچیوں کا یہ تقاضہ! دونوں کے دل بھر آئے اور بہ مشکل ضبط کرتے ہوئے اور آنسوؤں کو پیتے ہوئے وہ گھر میں داخل ہوئے گھر والے ان کی مصیبت سے بے خبر تھے اس لئے خوش خوش ان کے آس پاس جمع ہو گئے اور تجارت کے متعلق کچھ اُمید افزا خبریں سننے کے منتظر تھے کہ انہوں نے اپنی دکھ بھری کہانی سنا کر سب کو مغموم اور مایوس کر دیا۔ عبد القادر کے لڑکے نے جس کی عمر کوئی چھ برس کی ہوگی یہ تمام قصہ سنکر بہت ہی بھولے پن سے پوچھا کہ "ابا جی آپ نے تھانیدار سے کہہ کیوں نہیں دیا کہ ہم تو خالی تماشہ دیکھ رہے تھے"

گھر بھر میں کہرام مچ گیا اور جس مصیبت کو مردوں نے ایک بڑی حد تک آسانی سے برداشت کر لیا تھا اسے عورتیں نہ برداشت کر سکیں اور بری طرح چلا چلا کر رونا شروع کر دیا۔ تھانہ بھون کے تمام عقلا رسر سے سر جوڑ کر بیٹھے اور بہت سے حقے پینے اور ڈاڑھیونکو دانتوں کے نیچے دبانے کے بعد سب کی یہی رائے ہوئی کہ دونوں بھائیوں کے لئے یہی مناسب ہے کہ دہلی چلے جائیں اور جس طرح اور سب ملزم اپنے مقدمہ کے لئے کوشش کریں اسیطرح یہ بھی کرتے رہیں۔ بوڑھوں اور بوڑھیوں نے کانپتے ہوئے ہاتھ اٹھا اٹھا کر دعائیں دیں مسجد کے پیش امام صاحب نے ختم پڑھنے کا وعدہ کیا اور اس کے اثر کے بھروسہ پر ان کی امیدیں بندھائیں اور جوانوں نے جو اپنی لاٹھیوں کا سہارا لئے کھڑے تھے اپنی ہمدردی کا یقین اس طرح دلایا کہ "بھئی قادر میاں اگر کہیں کچھ لڑائی بھڑائی کا کام ہو تو ہم حاضر ہیں" دونوں بھائی اپنی بیوی بچوں کو ساتھ لئے دعاؤں کے شور و غل میں سب کو سلام کرتے ہوئے رخصت ہوئے اور تھوڑی دیر کے لئے تو انہیں فی الحقیقت یہ یقین ہو گیا کہ ہم بری ہو جائیں گے۔

دہلی میں رہکر وہ یہی کر سکتے تھے کہ دن بھر محنت مزدوری کر کے جو کچھ کمائیں اس میں سے چند پیسے تو روٹیاں خریدنے کے لئے رہنے دیں اور باقی کی تمام رقم وکیل صاحب کے محنتانہ کے لئے جمع کیا کریں جو مقدمہ کی پیروی کے لئے مامور تھا۔ مقدمہ ایک عرصہ دراز تک چلتا رہا اور بہت سی پیشیاں ہوئے اور تاریخیں بدلنے کے بعد بالآخر وہ دن آ گیا کہ جب فیصلہ سنایا جانیوالا تھا۔ دھڑکتے ہوئے دل اور کانپتے ہوئے ہاتھ پاؤں کے ساتھ دونوں بھائی عدالت کے احاطہ میں داخل ہوئے اور کمرہ میں گھسنے سے پہلے ایک مرتبہ نہایت حسرت کے ساتھ اپنی بیویوں اور بچوں پر انہوں نے اک نگاہ ڈالی جو ان کے پیچھے پیچھے آرہے تھے معصوم اور ناواقف حال بچے بھی اس مصیبت اور رنج سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے جس میں سارا گھر مبتلا تھا اور آج کسی ایک بچہ کے منہ سے بھی نہ نکلا کہ "اباجی ہمارے لئے مٹھائی لیتے آنا" بھولی بھالی سوگوار صورتوں پر دونوں کو پیار آگیا اور مامتا سے مجبور ہو کر انہوں نے اپنے اپنے بچوں کو خوب بھینچ بھینچ کر پیار کیا اور پھر ماؤں کے سپرد کر کے عدالت کے کمرہ میں داخل ہو گئے۔

✣

بوڑھوں کی دعائیں اور امام صاحب کے ختم سب بے اثر اور بے نتیجہ ثابت ہوئے اور جب حکم سنایا گیا تو تین تین سال کی سزائے سخت پانے والوں میں ان دونوں بھائیوں کے نام بھی تھے۔ سزا پانے والوں کا اگرچہ ایک جم غفیر تھا اور یہ مشہور ہے کہ "مرگ انبوہ جشنے دارد" لیکن ان دونوں بھائیوں کی حالت بہت سے سزا پانے والوں سے مختلف تھی۔ انہیں معلوم تھا کہ بیویوں کا ایک ایک چھلا تک وہ فروخت کر چکے ہیں اور اب دنیا میں کوئی ظاہری ذریعہ ایسا موجود نہیں ہے کہ وہ اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پال سکیں۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ ان کی بیویاں محنت مزدوری یا نوکری چاکری کی بھی عادی نہیں ہیں اس لئے ان کے لئے اس صورت سے بھی کسب معاش آسان نہیں ہے اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ کنبے میں

کوئی ایسا مرد بھی موجود نہیں ہے جو ان خاتونوں کی حفاظت کر سکے۔ سزا کا حکم سنتے ہی چھوٹے بھائی کو تو سکتہ ہو گیا اور وہ ایک بے جان بت کی طرح جہاں کھڑا تھا وہیں رہ گیا، اور بڑے بھائی پر اس صدمہ کا یہ اثر ہوا کہ وہ بے ہوش ہو کر عدالت کے کمرہ میں گر گیا جہاں سے پولیس والے اسے اٹھا کر باہر لے گئے اور ہوش میں لانے کی تدبیریں کرنے لگے۔ رخصت ہوتے وقت بچوں کا پیمانہ صبر چھلک گیا اور وہ دوڑ دوڑ کر اپنے اپنے باپ سے لپٹنے اور پوچھنے لگے کہ "ابا جی اب کہاں جا رہے ہو" باہر نکلتے ہوئے آنسوؤں کو زبردستی پی کر جب عبدالقادر نے کہا کہ "بیٹی ہم مال خریدنے جا رہے ہیں دو تین دن میں آجائیں گے" تو اس کی چھوٹی لڑکی کریم النساء نے گھگھیا کر کہا کہ "میرے اچھے ابا جی اب کی دفعہ میری اوڑھنی مت بھول جانا"

برقعہ پوش ماؤں کی کیا حالت تھی؟ آنکھوں کے نیچے نیچے برقعہ کی تمام نقاب کا بھیگا ہوا ہونا سب کچھ بتا رہا تھا

(ختم)

شہیدِ رسوم

مولوی کبیر الدین ایک بہت ہی مرنجان مرنج سیدھے سادے و نیک آدمی تھے بڑے متقی اور بہت پرہیزگار۔ باپ داوا کے وقت کی کچھ جائداد چلی آرہی تھی اسی پر بسر اوقات تھی یا کچھ تھوڑا بہت خود بھی دو چار لڑکوں کو پڑھا کر کما لیا کرتے تھے۔ زمانے کے حالات دیکھ دیکھ کر انہیں دنیا سے کچھ ایسی نفرت ہو گئی تھی کہ انہوں نے لوگوں سے ملنا جلنا ان میں اٹھنا بیٹھنا سب ترک کر دیا تھا' اور روزمرہ سیدھے راستے جانا اور بچوں کو پڑھا کر سودا خریدتے ہوئے گھر کو لوٹ آنا ان کا مشغلہ رہ گیا تھا۔ کبھی کبھی اگر کوئی ان کا پرانے زمانے کا دوست آجاتا اور ان سے اس بے تعلقی اور گوشہ نشینی کا سبب پوچھتا تو کہدیتے کہ "بھائی مسلمانوں کے غیر اسلامی رویے دیکھ دیکھ کر میرا دل اب کچھ ایسا بیزار ہو گیا ہے کہ کسی سے ملنے جلنے کا خیال تک نہیں آتا مسلمانوں کو حکم تو یہ ملا تھا کہ خدا کا آخری پیغام گھر گھر پہنچا دیں مگر وہ اپنا علم اور اپنا پیغام تو تمام دنیا کو سنانے کے لئے تیار ہیں اور سناتے رہتے ہیں لیکن خدا کے پیغام کی آواز خود اپنے گھر میں بھی نہیں آنے دیتے۔ آخر یہ وہی قوم تو ہے جس کے معمولی مزدوروں اور تاجروں کی ایمانداری' راست بازی' حق گوئی اور بنی نوع انسان سے ہمدردی دیکھ دیکھ کر بڑے بڑے بادشاہ حیرت میں رہ جاتے تھے اور ہزاروں کوس پر عرب کے ملک میں اپنے وزیروں اور مشیروں کو بھیجا کرتے تھے کہ جاؤ دیکھو تو یہ عرب میں کونسا نیا مذہب نکلا ہے جس نے عربوں کی کایا پلٹ دی اور انہیں حیوان سے کامل انسان بنا دیا آج وہی کامل اور مکمل انسان اپنی انسانیت کا جو نمونہ پیش کر رہے ہیں وہ ایسا ہے کہ حیوان بھی اس پر لعنت بھیجتے ہیں اور اس سے بھاگتے ہیں" اکثر ایسا ہوا ہے کہ راستہ کی گلی میں مولوی صاحب نے مسلمان بچوں کو ننگے سر ننگے بدن ننگے پاؤں گلی ڈنڈا

کھیلتے دیکھا اور کھڑے ہو کر دل ہی دل میں رونے لگے اور کہنے لگے کہ بار الٰہا! کیا یہ اسی قوم کے بچے ہیں جو سب امتوں سے بہتر ہے؟ کیا مسلمانوں کو اسی انسانیت کی تعلیم دیگئی تھی کہ وہ اپنا تمام وقت اور تمام روپیہ بے وجہ بے سبب برباد کیا کریں۔

خداوندا! جن بچوں نے بارہ چودہ سال کی عمر تک صرف یہی سیکھا ہے کہ سیروں خاک مٹی بدن پر تھوپ لیں، ماں بہن کی صدہا مغلظات آپس میں ایک دوسرے کو دے لیا کریں، اور دن بھر ڈنڈے بجاتے اور شور مچاتے پھرا کریں وہ کل بڑے ہو کر کیا کرینگے اس محنت اور سرمایہ داری کے زمانے میں کہ جب آدمی کو آدمی کھائے جاتا ہے ان انسان نماحیوانوں کی کیا حالت ہوگی، اور تیرا پیغام دوسروں تک پہنچانا تو کجا، یہ اپنا پیٹ بھی کس طرح پال سکیں گے، اور دنیا میں ان کے زندہ رہنے کی کیا سبیل ہوگی؟

مولوی کبیر الدین صاحب کا کنبہ بہت بڑا نہ تھا، ایک لڑکا تھا جسے گھر میں بٹھا بٹھا کر مولوی صاحب نے لڑکیوں سے بدتر بنا دیا تھا اور دو لڑکیاں جن میں سے ایک خدا رکھے جوان تھی اور اس کی شادی آیندہ عید کے مہینے میں ہونے والی تھی۔ ماں اچھی اور باپ نیک ہو تو اولاد بھی بالعموم نیک اور اچھی ہی ہوتی ہے، مولوی صاحب کے بچے بھی تینوں کے تینوں بے حد نیک اور لایق تھے۔ محلہ میں ایک گھر ایسا نہ تھا جس کی عورتوں کی زبان پر مولوی صاحب کی بڑی لڑکی حمیدہ کی تعریف نہ ہو، اور غریب اور جاہل محلے والوں میں سے ہر ایک صغیر الدین کا ممنون احسان تھا کہ وہ کبھی ان کے خطوط لکھدیا کرتا تھا، اور کبھی اگر وہ بیمار ہوں تو اسپتال سے دوا اور بازار سے سودا سلف لادیا کرتا تھا

شب برات کا دن تھا، اور گو یوں تو مسلسل پندرہ بیس روز سے برابر ہر طرف سے دھوں پٹاخ کی آوازیں آتی ہی رہتی تھیں مگر آج کی شام تو حقیقتاً صبح قیامت تھی۔ ہر گلی اور ہر سڑک بلجیم کی جنگ کا میدان بنی ہوئی تھی، گولوں اور پٹاخوں کی آوازیں جرمنی کی سترہ انچ والی توپوں کو بھی مات کر رہی تھیں اور چھچھوندروں،

اناروں، اور پھلجھڑیوں کی کثرت نے تمام راستوں کو آگ اور شعلوں کا سمندر بنا دیا تھا۔ مولوی کبیر الدین صاحب کے گھر سے قریب ہی دوسری گلی میں ایک بیچاری ضعیفہ سیدانی رہا کرتی تھیں۔ سیدانی کی عمر کچھ اوپر ساٹھ برس کی تھی، اور انہیں حمیدہ سے کچھ ایسی محبت ہو گئی تھی کہ قریب قریب روزمرہ ہی اس کے پاس آتیں اور گھنٹہ دو گھنٹے بیٹھکر چلی جاتیں۔ آج شومئی تقدیر کہ صبح ہی صبح اندھیرے میں جب وہ پاخانہ گئیں تو ان کا پاؤں پھسل گیا اور بے چاری چاروں شانے چیت گر پڑیں۔ بڑھاپے کی عمر، ہاتھ پاؤں میں ناطاقتی، بے اختیاری کا گرنا، اور پھر جاڑے کی چوٹ، سیدانی بیچاری کچھ ایسی پڑیں کہ اٹھنا بیٹھنا ناممکن ہو گیا۔ گھر بھر میں یا تو ایک ان کا اپنا دم تھا یا ایک بالشت بھر کا نواسہ جس کی عمر بمشکل آٹھ برس کی تھی، وہ غریب کیا خدمت کرتا۔ اس کے لئے یہی بہت تھا کہ اس نے جا کر حمیدہ کو خبر کر دی۔ رات کو کوئی آٹھ بجے کے قریب حمیدہ اور اس کی ماں دونوں برقعہ اوڑھکر نکلیں کہ سیدانی بی کی عیادت کر آئیں۔ گلی میں لڑکوں کا شور و غل اور گولوں اور پٹاخوں کی مہیب آوازوں کا یہ عالم تھا کہ بیچاری عورتوں کے دل کانپے جا رہے تھے اور چاروں طرف آگ اور شعلوں کی وہ کثرت تھی کہ قدم آگے رکھنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ ابھی سیدانی کا گھر کوئی بیس قدم آگے ہو گا کہ یکایک ایک لڑکے نے چھچھوندر جلا کر پھینکی اور وہ کچھ ایسی تیزی سے چکر لگا کر حمیدہ کے برقعے کے اندر گھس گئی کہ وہ لاکھ اچھلی کودی اور بہتیرا بچی مگر کسی طرح اس سے محفوظ نہ رہ سکی اور چاروں طرف سے اس کے کپڑوں میں آگ لگ گئی کپڑوں میں آگ لگی ہوئی دیکھکر حمیدہ چیخ مار کر الٹی اپنے گھر کو بھاگی اور جسقدر تیز وہ دوڑتی تھی اسی قدر ہوا لگ کر آگ اور زیادہ تیز اور روشن ہوتی جاتی تھی۔ اس خستہ و خراب حالت میں کہ کپڑے تمام جل چکے تھے اور سینکڑوں جگہ سے بدن جھلس گیا تھا حمیدہ بدقت تمام گھر پہنچی۔ سب کپڑوں کے جل جانے کی وجہ سے آگ تو خود ہی بجھ گئی تھی

مگر چونکہ ہر چہار طرف سے بدن جل گیا تھا اس لئے حمیدہ نہ کسی کروٹ لیٹ سکتی تھی اور نہ بیٹھا جاتا تھا۔ جلدی جلدی اس کے جسم پر اور کپڑے ڈالے گئے اور ناریل کا تیل اور چونے کا پانی ملاکر اس میں کپڑے تر کرکے اس کے بدن پر رکھے جانے لگے۔ اگر حمیدہ ایک دو جگہ سے جلی ہوتی تو ٹھنڈک پڑ جاتی، مگر سر سے پاؤں تک اس کا تو سارا بدن جل چکا تھا اس لئے اسے کسی طرح قرار نہ تھا۔ حمیدہ کی تکلیف، اس کی ماں کا رونا، اور مولوی صاحب کی پریشانی اور بدحواسی یہ سب چیزیں اس حد تک پہنچ گئی تھیں۔ کہ بیان نہیں ہوسکتیں۔

حکیم بھی آئے اور ڈاکٹر بھی، دوا بھی کی گئی اور دعا بھی، مگر حمیدہ کی حالت روز بروز بد سے بدتر ہوتی چلی گئی اور بالآخر پندرہویں روز جبکہ اس کی حالت بہت ہی خراب ہوچکی تھی اور وہ دو چار منٹ کی مہمان معلوم ہوتی تھی تو اس نے بڑی مشکل سے رک رک کر نہایت ہی نحیف و ناتواں آواز میں باپ سے کہا:۔

حمیدہ۔ ابا جان! میرے لئے رونے سے کچھ فائدہ ——— نہیں، آپ اگر ——— چاہیں تو ——— مسلمانوں کی ——— اصلاح کر سکتے ہیں یہ مسلمان بدراہ ——— ہوگئے ہیں ——— تو ان سے نفرت نہ کیجئے ——— ان سے بھاگنے کی بجائے ——— ان میں گھسکر ——— ان کی حالت ——— درست کیجئے ——— ان بری رسموں ——— کو بند کرائیے ——— میری روح ——— آپ کی ——— کام یابی ——— کے ——— لئے ——— دعائیں ——— مانگا کریگی ——— اٹھئے اور ——— کام کیجئے ——— اس کے بعد آخری ہچکی نے اس شہید رسوم کی روح کو قفس عنصری سے آزادی دی۔

———(※)———

سیدانی کے روزے

نواب رفیع الدین خاں صرف نام ہی کے نواب نہ تھے بلکہ خدا کے فضل و کرم سے ایک بہت بڑی جائداد کے مالک بھی تھے اور شہر کے سب سے بڑے رئیسوں میں آپکا نام شمار ہوتا تھا۔ کنبہ اگرچہ بہت بڑا تھا لیکن ان کی آمدنی بھی اس قدر زیادہ تھی کہ گاڑی گھوڑا نوکر چاکر سب کا خرچ نکال کر سال بھر میں پانچ سات ہزار روپیہ بچ ہی رہتے تھے، اور اگر نواب صاحب تھوڑی سی بھی کفایت شعاری سے کام لیتے اور اپنے غیر ضروری اخراجات کچھ کم کر دیتے تو یقینی طور پر شہر میں ان سے زیادہ مالدار کوئی نہ ہوتا نواب صاحب کے دو بچے مر کے تیسرا لڑکا بچا تھا اور اب اللہ آمین سے پل پلا کر سترہ برس کا نوجوان ہو گیا تھا شفیع الدین نے بڑے ناز و نعم میں پرورش پائی تھی اور اگر اس کی عادتیں اور مزاج بالکل بگڑ جاتا تو ذرا بھی تعجب نہ ہوتا مگر وہ خدا جانے کس قماش کا بچہ تھا کہ ماں باپ کے لاڈ پیار نے اس پر کوئی اثر نہ کیا اور وہ امیروں کے بچوں کے خلاف حد سے زیادہ محنتی جفاکش اور معقول پسند لڑکا تھا۔ اس عمر میں ضد اور ہٹ کرنا تو درکنار اس نے کبھی اس وقت بھی ضد نہ کی اور ماں کو یا انا کو دق نہ کیا کہ جب وہ بالکل بچہ تھا وہ ہر ایک بات کو سمجھنے کی کوشش ضرور کرتا اور جب اس کی سمجھ میں وہ بات آجاتی تھی تو مطمئن ہو کر خاموش ہو جاتا تھا اپنے نوکروں کے ساتھ اس کا برتاؤ بسا اوقات اس قدر مساویانہ ہوتا تھا کہ باپ کو برا معلوم ہوتا تھا اور وہ کبھی کبھی کہہ بھی دیا کرتے تھے کہ "بیٹا نوکروں کے ساتھ اتنی بے تکلفی اور ایسا برابر والوں کا سا برتاؤ ٹھیک نہیں ہے" مگر اس کا جواب شفیع الدین کی طرف سے ہمیشہ یہی ملتا کہ "ابا جان انسان ہونے کے لحاظ سے تو سب

برابر ہیں پھر میں خدا بخش کو حقیر اور ذلیل کیوں خیال کروں" شفیع الدین کی تعلیم بھی بہت اچھی تھی فارسی اور عربی اچھی طرح پڑھ چکنے کے بعد اب وہ انگریزی میں بھی ایف اے پاس کرچکا تھا اور بی اے کی تیاریوں میں مصروف تھا. باپ کی انتہائی کوششوں کے باوجود اس میں کبھی امارت کی وہ بو جس کا صحیح نام غرور ہے پیدا نہ ہوئی" اور ہمیشہ اس کی ہمدردی انسانیت کے اسی طبقہ کے ساتھ محدود رہی جو مفلس، محتاج اور نادار کے نام سے مشہور ہے. اس قدر سادہ مزاج اور مسکین طبع ہونے کے باوجود شفیع الدین اپنی دھن کا بڑا پکا اور عزم وارادہ کا بڑا مضبوط تھا، اور جب وہ کسی کام کے متعلق مدلل طریق پر اپنی رائے کا اظہار کردیتا تھا تو پھر بالعموم کسی کی ہمت نہ ہوتی تھی کہ اس کے خلاف آواز نکالے.

رمضان شریف کے دن تھے اور جمعہ کے روز حسب معمول شفیع الدین اپنے پڑوس میں ایک سیدانی کے گھر مزاج پرسی کے لئے گیا. اس نے ایک عرصہ سے یہ عادت اختیار کرلی تھی کہ ہر جمعہ کو اپنے محلہ کے غریب آدمیوں کے پاس جاتا اور ان سے ان کی حاجتیں معلوم کرکے تا حد امکان پورا کردینے کی کوشش کرتا. بیوہ سیدانی سدا کی غریب اور محتاج نہ تھیں. جب میر فضل علی مرحوم زندہ تھے تو سیدانی صاحبہ ایک اچھی خاصی امیرانہ زندگی بسر کیا کرتی تھیں. گھر میں پلنگ اور مسہریاں بھی تھیں اور دالان میں اُجلا فرش اور گاؤ تکیے بھی، کھانا پکانے کے لئے ماما بھی نوکر تھی اور باہر کے کام کے لئے ایک مرد خدمتگار بھی. خاوند کی زندگی میں انہوں نے اچھا کھایا اور اچھا پہنا، اور شہر کی بیگموں میں یہ بات عام طور پر مشہور تھی کہ سیدانی صاحبہ سے زیادہ کپڑا پہننے کی تمیز شاید ہی کسی کو ہو. مثل مشہور ہے کہ "جس کی مایا اس کے سب" یہ مثل میر فضل علی پر حرف بحرف صادق آئی تھی اور ان کی آنکھیں بند ہوتے ہی ایسا معلوم ہوا کہ جیسے گھر میں کسی نے جھاڑو پھیردی اور ان کے انتقال کے سال بھر کے بعد بیچاری سیدانی کی فاقوں پر نوبت آگئی

زیور اور مکان سب بک گیا اور ان کی ناتجربہ کاری اور حساب وکتاب سے ناواقفیت کی وجہ سے روپے میں آٹھ آنہ بھی ان کے پلے نہ پڑے۔ سیدانی صاحبہ کی ایک لڑکی تھی جس کی عمر کوئی بارہ سال کی ہوگی اور ایک لڑکا تھا جو بیسیوں بیماریوں سے بچ بچاکر اب کوئی سات برس کا ہونے پایا تھا۔ اس کنبے کی گذر صرف اس آمدنی پر تھی جو سیدانی صاحبہ کی سلائی سے ہوجایا کرتی تھی اور یہ اسی قدر مختصر تھی کہ روٹی مل گئی تو کپڑا نہ تھا اور کپڑا مل گیا تو روٹی نصیب نہ ہوئی۔ کڑاکے کے جاڑے ان تینوں نے صرف ایک پھٹے پرانے لحاف میں گذارے تھے جس میں کئی برس کی پرانی روئی جابجا اکٹھی ہوکر جمع ہوگئی تھی اور ابرا اور استر دونوں سیدانی صاحبہ کی مرمتوں کے باوجود جابجا سے تار تار تھے۔ پہننے کے کپڑوں کی حالت کچھ اس سے بھی بری تھی اور کلثوم کو دن میں تین تین دفعہ اپنا پائجامہ سینا پڑتا تھا جو پرانا ہونے کی وجہ سے جابجا سے ذرا ذرا سی حرکت پر پھٹ جاتا تھا۔ شفیع الدین کو سیدانی صاحبہ پر بڑا ترس آتا تھا اور وہ جہاں تک بن پڑتا تھا ان کی امداد کرتا رہتا تھا۔ محلہ میں اگر صرف ایک ہی سیدانی غریب ہوتیں تو شفیع الدین کی امداد یقیناً ان کی تکلیفوں کو دور کردیتی، مگر بدقسمتی سے محلہ کی آبادی میں زیادہ حصہ ایسے ہی لوگوں کا تھا جن کو دونوں وقت پیٹ بھر کر روٹی میسر نہ آتی تھی، اس لئے وہ تھوڑا تھوڑا اور حصہ رسد سب کو دیتا رہتا تھا۔

شفیع الدین کو دیکھکر سیدانی صاحبہ ہمیشہ باغ باغ ہوجایا کرتی تھیں اور آج بھی جب شفیع الدین پہنچا تو انہیں بہت خوشی ہوئی۔

شفیع۔ کہئے سیدانی صاحبہ مزاج اچھا ہے۔ روزے ہو رہے ہیں؟

سیدانی۔ ہاں بیٹا۔ خدا تمہیں جیتا رکھے۔ ہم گنہگاروں کے روزے ہی کیا۔ خدا قبول کرے۔ جیسے کچھ بھی ہوں رکھ ہی لئے جاتے ہیں۔

شفیع۔ سحری کا کیا انتظام ہے۔ رات کو پکا کر رکھ لیتی ہو یا اسی وقت پکاتی ہو۔

سیدانی۔ بیٹا سحری تو ہم کھایا ہی نہیں کرتے (ایک ٹھنڈا سانس بھر کر) اللہ تیرا لاکھ لاکھ احسان ہے کہ تو ایک وقت مجھکو دیئے جاتا ہے۔ ہمارا منہ تو اس لائق بھی نہ تھا۔

شفیع۔ تو آپ برابر بغیر سحری کے روزے رکھا کرتی ہیں؟

سیدانی۔ بیٹا ہمیں تو مدتیں گذر گئیں ایک ہی وقت کھانا کھاتے ہیں اور اب کچھ عادت سی ہو گئی ہے۔

شفیع۔ (تعجب سے) آپ ہمیشہ ایک ہی وقت کھاتی ہیں؟

سیدانی۔ بیٹا دوسرے وقت آئے کہاں سے دن بھر میں بھی سیتی رہتی ہوں اور کلثوم بھی بیچاری سوئی سے سر مارتی رہتی ہے تب کہیں جا کے شام کو اتنا ہو جاتا ہے کہ روکھی سوکھی پیٹ میں پڑ جائے۔ اب میری تندرستی نے بھی جواب دیدیا اور اکثر میں بیمار ہو جاتی ہوں تو اتنا بھی نہیں ہوتا کہ ایک ہی وقت کی روٹی میسر آئے (آنکھوں میں آنسو بھر کر) خدا کی مرضی وہ جس حال میں چاہے رکھے اُسی نے وہ زمانہ بھی دکھایا تھا کہ میں عیش کرتی تھی اور اسی نے یہ دن بھی دکھائے ہیں اپنا تو کچھ نہیں، میں تو اب قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھی ہوں، ان بچوں کی تکلیف سے کبھی کبھی جی دکھ جاتا ہے اور میں سوچا کرتی ہوں کہ ان معصوموں نے کیا خطا کی ہے کہ میرے ساتھ ان کی بھی مٹی پلید ہو رہی ہے یہی کلثوم ہے جس کے ایک اشارے پر دنیا زمانے کی چیزیں حاضر ہو جاتی تھیں یا آج اسی کی یہ حالت ہے کہ دن بھر محنت کر کے بھی اسے پیٹ کو ٹکڑا اور تن کو چیتھڑا نہیں جڑتا۔ خدا انہیں جنت نصیب کرے، جب اس کے باپ زندہ تھے (آواز بھرانے لگی) تو میں اگر کام کاج سکھانے کے لئے کلثوم سے کچھ کام کراتی تو وہ مجھ پر خفا ہوا کرتے تھے کہ تم نے تو لڑکی کو گھر کی ماما بنا دیا ہے (آواز رک گئی) ہائے! انہیں کیا خبر تھی کہ اس کی تقدیر میں دن دن بھر سلائی کا سینا

اور فاقے کرنا لکھا ہے (رونے لگیں)

شفیع الدین کا بھی دل بھر آیا اور مزید گفتگو کی تاب نہ لا کر وہ وہاں سے چلدیا۔

(۶)

انجمن اصلاح المسلمین فیروزپور کا ایک غیر معمولی جلسہ آج طلب کیا گیا ہے اور نواب رفیع الدین خاں صاحب کی عالی شان کوٹھی میں اس انجمن کے ممبر ایک بہت بڑی تعداد میں جمع ہیں، جلسہ کا جو اعلان شائع کیا گیا تھا اس میں جلسہ کی غرض صرف یہ بتائی گئی تھی کہ انجمن کے سکرٹری صاحب کوئی نہایت ہی ضروری تقریر کریں گے۔ لوگوں کو اپنے سکرٹری سے بے حد محبت اور عقیدت تھی اس لئے ہر شخص اس ضروری تقریر کا بیتابانہ منتظر تھا۔ ٹھیک وقت پر شفیع الدین جلسہ کے کمرہ میں آیا اور اسے دیکھتے ہی سب لوگوں کے چہرے خوشی سے دمک اٹھے۔ حاضرین میں بہت زیادہ تعداد نوجوانوں کی تھی، اور وہ سب کے سب شفیع الدین کو بے حد عزیز رکھتے تھے، اور وہی اس انجمن کا سکرٹری تھا۔

صدر کا باقاعدہ انتخاب ہو جانے کے بعد شفیع الدین کھڑا ہوا اور ایک مرتبہ غائر نگاہ سے مجمع کو دیکھکر نہایت صاف بلند اور شیریں آواز میں اس نے کہا:۔

برادران! آج سب صاحبان کی تکلیف کا باعث انجمن کا کوئی کام نہیں ہے بلکہ میں ہوں، میں آج آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آیا درحقیقت آپ کے دل میں اپنی قوم کی اصلاح کرنے کا کوئی جذبہ موجود ہے یا یہ کہ ملک کی اور صدہا انجمنوں کی طرح سے آپ بھی یہی چاہتے ہیں کہ آپ کے کارنامے سال بھر میں تین چار جلسوں تک یا چند پر جوش تقریروں تک محدود رہیں۔ میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ اب پانی سر سے گذر چکا ہے اور اب کسی طرح بھی اتنا وقت باقی نہیں رہا کہ آپ بیٹھے ہوئے اب بھی اطمینان سے باتیں بنایا کریں جو کچھ میں نے آج دیکھا ہے اس سے میرا دل دہل گیا ہے اور اگر آپ نے بھی دیکھا ہوتا

تو آپ بھی ضرور میرے ساتھ رو رہے ہوتے۔ ہم مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ ہم بیں فیاضی ہے ہم مخیّر ہیں، اور ہمارے عزبا تک بہت کچھ خیرات کیا کرتے تھے اور ہمارا دعویٰ یہ بھی ہے کہ ہم میں اسلامی اخوت اور ہمدردی بھی ہے اور ایک مسلمان کی تکلیف سے ہر مسلمان بے چین ہو جاتا ہے لیکن انصاف اور ایمان سے کہئے کہ کیا یہ تمام دعویٰ بے بنیاد اور جھوٹی شیخیوں کے مرادف نہیں ہیں؟ وہ ہماری فیاضی اور خیرات اور مہمان نوازی اور زکوٰۃ کہاں چلی جاتی ہے اور کس کے کام آتی ہے جبکہ ہر شخص جانتا ہے اور روزمرہ اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے کہ ہر محلے میں دس بیس پچاس غریب اور مفلس بیوائیں فاقوں پر فاقے کرکے زندگی بسر کر رہی ہیں اور قوم کے یتیم بچوں کو اپنے کلیجے سے لگا لگا کر پال رہی ہیں، ہماری وہ اخوت اور ہمدردی کس کام آئے گی۔ جبکہ یہ واقعات ہمارے پیش نگاہ ہیں کہ ہماری قوم کے نادار اور غریب بچے دس ہی برس کی عمر میں ٹوکری ڈھونے پر مجبور ہو جاتے ہیں، اور کچھ پڑھنا لکھنا تو درکنار، انہیں معمولی نماز روزہ کے مسائل بھی کوئی نہیں بتاتا؟ ظاہر ہے کہ یا تو مسلمانوں نے زکوٰۃ نکالنی اور خیرات کرنی بالکل چھوڑ دیا ہے یا اگر جیسا کہ کہا جاتا ہے وہ خیرات اب بھی کیا کرتے ہیں تو یقینی طور پر وہ ایسے لوگوں کو دی جاتی ہے جو ہرگز اس کے مستحق نہیں ہیں اور وہ بے کس اور محتاج لوگ اس سے محروم رہتے ہیں جنہیں بھیک مانگنے کے فن میں مہارت نہیں ہے، یہ رمضان کا مہینہ ہے اور آپ میں سے ہر شخص سحری افطار کے لئے نہ معلوم کس قدر خرچ کرکے انتظامات کیا کرتا ہے لیکن کیا آپ کو خبر ہے کہ ہر شخص کے محلے میں اور ہر خوشحال آدمی کے پڑوس میں کم از کم دس دس اور بیس بیس ایسے یتیم اور ایسی بیوائیں رہتی ہیں جنہیں برابر سال بھر ایک وقت فاقہ کرنا پڑتا ہے اور جنہیں سحری یا افطاری تو درکنار ایک وقت پیٹ بھر کر روٹی بھی بہ مشکل نصیب ہوتی ہے؟ میں جانتا ہوں اور اچھی طرح جانتا ہوں کہ پاک مذہب اسلام نے ہمیں زکوٰۃ دینے کا حکم اسی لئے

دیا ہے کہ ہماری بیوائیں اور ہمارے یتیم فقر وفاقہ میں مبتلا ہو کر ذلت کی زندگی بسر کرنے پر مجبور نہ ہوں، لیکن ان احکام کا فائدہ کیا جبکہ اسلام کے نام لیوا کبھی ان پر عمل ہی نہ کریں؟ آج میں نے ایک غریب پردہ نشین سیدانی کو دیکھا ہے جو محنت مزدوری کر کے اپنا اور اپنے دو بچوں کا پیٹ پالا کرتی ہیں اور ماں بیٹیاں دونوں بغیر سحری کے برابر روزے رکھ رہی ہیں۔ اگر شہر بھر میں بھی ایک یا دو عورتیں ہوتیں تو کچھ بات نہ تھی لیکن میں جانتا ہوں اور آپ سب کو معلوم ہے کہ ایسی بے کس اور بے بس عورتوں سے محلے بھرے پڑے ہیں اور مسلمانوں کی بستی میں ہر تیسرا گھر ایسا ہی ہے کہ جس کے باشندوں کو بمشکل ایک وقت روٹی میسر آتی ہے اور موٹا جھوٹا کھانا اور پھٹا پرانا پہن لینے کے علاوہ وہ خدا کی تمام نعمتوں سے محروم ہیں۔ برادران! کیا آپ کے دل میں اپنی قوم کے اس بے کس طبقہ کا کوئی درد ہے اور آپ ان کے لئے کچھ کرنے پر آمادہ ہیں؟ اگر ہیں تو خدا کے لئے اٹھیئے اور ہر ہر محلہ کے مسلمانوں کو مجبور کیجئے کہ وہ الگ الگ بطور خود خیرات اور زکوٰۃ دینے کی عادت چھوڑیں اور ہر محلہ میں اسی محلہ کے مسلمانوں کی رائے سے تین نیک اور ایماندار مسلمانوں کی ایسی کمیٹی بنوا دیجئے جو باقاعدہ رسیدیں دیکر اس محلہ کی تمام خیرات اور تمام زکوٰۃ وصول کیا کرے۔ اس کمیٹی کے پاس اس محلہ کے تمام نادار اور غریب لوگوں کی فہرست ہو جو خیرات کے مستحق ہیں اور وہ انکی ضرورتوں کے لائق انہیں دیدیا کرے تاکہ معذور الخدمت اور محتاج لوگ اپنی زندگی آرام سے بسر کر سکیں اور باقی تمام روپیہ شہر کے بیت المال میں جمع کر دیا جائے جہاں سے اسے قوم نے بچوں کی تعلیم اور تربیت پر صرف کیا جا سکے۔ اگر آپ ایسے بیت المال قائم کرانے میں کامیاب ہو گئے اور مسلمانوں کی زکوٰۃ اور خیرات صحیح مصرف میں استعمال ہونے لگی تو آپ یقین کیجئے کہ مسلمانوں میں پھر کوئی غریب یا جاہل ڈھونڈھے سے نہ ملیگا۔ اور آپ کی ,, اصلاح المسلمین " بجا طور پر اپنے نام کی مستحق ہو جائے گی۔

تقریر کا اثر حسب منشا ہوا اور فیروزپور کے مسلمان زکوٰۃ و خیرات کے انتظام پر آمادہ ہوگئے اور صرف دو سال کے بعد سیدانی صاحبہ کا بچہ فرزند علی صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے اسلامیہ اسکول کو جاتا نظر پڑا جو تقریباً محلے محلے قائم ہوگئے تھے۔

شفیع الدین نے اس عرصہ میں بی اے پاس کرلیا تھا اور اصلاح المسلمین کے قائم کئے ہوئے اسلامیہ سکول میں بلا تنخواہ ہیڈ ماسٹری کے لئے اپنی زندگی وقف کردی تھی۔

والدین کے اصرار پر وہ شادی کے لئے رضامند ہو گیا اور امیر و غریب کا فرق اُٹھا دینے کے لئے اس نے اپنی والدہ سے کہدیا کہ وہ اپنے محلے کی سیدانی صاحبہ کی لڑکی سے شادی کرنا پسند کرتا ہے۔ بادل ناخواستہ ماں باپ کو راضی ہونا پڑا اور سیدانی صاحبہ کو اپنی زندگی میں یہ فخر بھی حاصل ہو گیا کہ شہر کے سب سے بڑے رئیس کا لڑکا ان کے گھر دولہا بنکر

آیا تھا



عید کے دن شادی

جمیلہ۔ میں کہتی ہوں کہ تم کیوں نہیں اپنے دوست کو کچھ سمجھاتے۔ آخر انہیں کیا خدا کی سنوار ہے کہ روز بیچاری بیوی کو دق کیا کرتے ہیں۔

عقیل۔ کونسے میرے دوست؟ کس کا ذکر کر رہی ہو

جمیلہ۔ یہی نفیسہ کے باپ اور کون۔ اور میں تمہارے دوستوں کو کیا جانوں؟

عقیل۔ کیا ہوا؟

جمیلہ۔ ہوتا کیا۔ نفیسہ کی ماں نے نفیسہ کی اوڑھنی کے لئے ان سے ریشمی بیل منگوائی تھی۔ انہوں نے اس کے بدلے دو تین پیسے گز والا فیتہ لا کے ڈال دیا۔ اور لائے بھی کل شام کو۔ اب آج عید کا دن ہے اتنا وقت بھی نہ تھا کہ وہ اسے پھروا دیتیں یا کسی اور سے بیل منگوا لیتیں۔ اسپر وہ کچھ ناراض ہوئیں بس پھر کیا تھا اللہ دے اور بندہ لے ناصر صاحب نے ایک سانس میں سو صلواتیں سنائیں اور شاید مارا پیٹا بھی۔ کل دن بھر کا روزہ تھا اور شام کو پانی کے گھونٹ سے روزہ افطار کے وہ ویسی ہی پڑی ہوئی ہیں اور اب تک نہ کچھ کھایا ہے نہ کچھ پیا ہے۔ ادہر وہ لڑکی بیچاری ماں کو اس طرح پڑا ہوا دیکھکر رو رو کر اپنا خون کئے لیتی ہے۔ بچے ان باتوں کو کیا جانیں۔ اسے تو اپنی عید کی اور عید کے کپڑوں کی پڑی ہے ناصر صاحب صبح سویرے ہی سے کہیں چلدیئے ہیں اور گھر میں یہ کہرام مچا ہوا ہے۔

عقیل۔ مگر مجھے تو یاد پڑتا ہے کہ ابھی الوداع کے دن انہوں نے ریشمی بیل خریدی تھی اور میں نے پوچھا تو کہا بھی تھا کہ نفیسہ کی اوڑھنی کے لئے ہے پھر تم کس طرح کہہ رہی ہو کہ بیل لا کر نہیں دی۔

جمیلہ۔ ہاں اس دن تو وہ بیل لائے تھے مگر اتفاق سے صغری (نفیسہ کی ماں چولہے کے پاس بیٹھی ہوئی اسے کھولکر دیکھ رہی تھیں کہ وہ ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر انگیٹھی میں گر پڑی۔ اور ایسی خوبصورت بیل۔ نگوڑی سب کی سب جل گئی۔ اسی غصہ کی وجہ سے ناصر صاحب نے پھر وہ بیل لاکر نہ دی اور جب صغری نے کچھ شکایت کی تو اسے مارا۔

عقیل۔ تمہاری صغری ہیں تو بڑی پھوہڑ۔ میں ان کے پھوہڑ پن کی بیسیوں باتیں سن چکا ہوں۔

جمیلہ۔ تم تو خواہ مخواہ اپنے دوست کی طرفداری کر رہی گے۔ اب اتفاق سے بیچاری کے ہاتھ سے بیل انگیٹھی میں گر گئی تو اسے پھوہڑ ہی بنا دیا۔

عقیل۔ اتفاق تو اسے کہتے ہیں جو کبھی کبھی ہو ان بیگم صاحب کے ہاتھ سے تو روزمرہ ہی کچھ نہ کچھ نقصان ہوتا رہتا ہے۔ اس دن تم ہی کہہ رہی تھیں کہ ناصر صاحب بڑی خوبصورت چینی کی پلیٹیں لائے تھے اور پندرہ دن میں چھ کی چھ انہوں نے توڑ کے رکھ دیں۔ میں نے اکثر ناصر صاحب کے ہاں چار پی ہے اور کبھی یاد نہیں پڑتا کہ چار کی پیالی کا کنڈہ ثابت تھا حالانکہ پچھلے ہی جاڑوں میں ناصر نے کم سے کم تین سٹ چار کے خریدے پانی کے گلاسوں کا بھی ان کے یہاں یہی حال ہے خدا جھوٹ نہ بلائے تو سال بھر میں کم سے کم سو تو ضرور ہی ٹوٹ جاتے ہیں اور سب اتفاق سے ہی ٹوٹتے ہیں۔ کپڑے کا خرچ آدمیوں کی تعداد کے لحاظ سے میرا اور ناصر کا برابر ہونا چاہیئے خاصکر اس لئے بھی کہ ہم دونوں ایک ہی دوکان سے ایک ہی طرح کا کپڑا خریدا کرتے ہیں لیکن میں نے خود دیکھا ہے کہ تمہاری صغری بیگم کے لئے تم سے چوگنا کپڑا خریدا جاتا ہے۔ ان کے پاس کپڑا بھی اتفاق ہی سے زیادہ پھٹا کرتا ہے۔ پھر میں نے یہ بھی سنا ہے اور دو چار مرتبہ تجربہ بھی ہوا کہ کبھی ان کی ہنڈیا کا نمک ٹھیک نہیں ہوتا۔ ایک دن اتفاق سے زیادہ ہو جاتا ہے۔ اور ناصر کو بازار سے ربڑی وغیرہ منگا کر روٹی کھانی

پڑتی ہے تو دوسرے دن اتفاق سے کم ہوتا ہے اور اوپر سے نمک ڈال کر کھانا پڑتا ہے۔ مرچوں کا بھی یہی حال ہے۔ کبھی تو اتفاق سے ایسی ہوتی ہیں کہ نوالہ منہ میں نہیں رکھا جاتا اور کبھی سالن بالکل پھیکا سیٹھا رہ جاتا ہے اب ان تمام باتوں کو تم اتفاق ہی کہوگی نفیسہ کی صورت شکل ایسی اچھی ہے اور اس کی باتیں ایسی بھولی بھالی ہیں کہ سب کو اس پر پیار آتا ہے۔ مگر ایمان سے کہو کبھی کسی دن بھی تم نے اس کے کپڑے صاف دیکھے اسے پیار کرنے کو جی چاہتا ہے مگر اس کے بالوں میں سے اس کے کپڑوں میں سے اور اس کے سارے بدن سے کچھ ایسی بساندی بو آتی ہے کہ گھن آنے لگتی ہے۔ اور یہ تمہیں خود معلوم ہے کہ نفیسہ کے پاس تمہاری حسینہ سے کپڑے کچھ زیادہ ہی ہیں کم نہیں ہیں (ایک خاص انداز سے بیوی کی طرف دیکھکر) حسینہ بھی کچھ بہت صاف ستھری نہیں رہتی مگر اتفاق سے نفیسہ سے ہمیشہ زیادہ صاف ہوتی ہے۔

جمیلہ (تنک کر) اے ہے تو میں نے کب کہا تھا کہ میں سگھڑ ہوں۔ جیسا کچھ مجھے آتا ہے میں حسینہ کو رکھتی ہوں۔ تم دیکھ کے کوئی سگھڑ کیوں نہ کرلائے۔ بہرحال پھوہڑ میں ہی ہوں اور پھوہڑ صغری بھی ہے۔ جیسے (خاص انداز سے مسکرا کر) تم ایک پھوہڑ کے ساتھ گذارا کر لیتے ہو۔ ناصر صاحب کیوں نہیں کرسکتے۔ میں تو تمہارے ہاتھ سے کبھی نہیں پٹی وہ کیوں روز ایک بیچاری کمزور عورت پر ہاتھ اٹھایا کرتے ہیں۔

عقیل۔ یہ یقیناً ان کی غلطی ہے۔ مارنا پیٹنا سخت بری بات ہے۔

جمیلہ۔ تو پھر انہیں سمجھاتے کیوں نہیں۔ یہ برس کے برس دن ان کے گھر میں قیامت برپا ہے یہ کوئی اچھی بات ہے۔ بیوی الگ فاقے سے پڑی ہوئی ہے لڑکی الگ رو رو کے اپنی جان ہلاک کئے لیتی ہے۔

عقیل۔ ناصر کو تو میں سمجھادوں گا اور مجھے امید ہے کہ وہ سمجھ بھی جائیں گے مگر کیا صغری کو تمہارے خیال میں سمجھانے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔

جمیلہ۔ نہیں یہ میں کب کہتی ہوں کہ صغریٰ جنت کی حور ہیں۔

عقیل۔ بات یہ ہے کہ مرد چونکہ دن بھر محنت مزدوری کر کے اور چوٹی کا پسینہ ایڑی تک بہا کے ہزار دقت و خرابی کے ساتھ روپیہ پیدا کرتا ہے اس لئے ناممکن ہے کہ اسے اپنی کمائی سے محبت نہ ہو اور وہ اس کا برباد ہونا خوشی سے گوارا کرے۔ جب کہ وہ خود اپنی بیوی اور اپنے بچوں کے لئے اس قدر مصیبت برداشت کرتا ہے تو قدرتی طور پر اس کی یہ خواہش ہونی چاہیئے کہ اس کی بیوی اپنی محنت اور لیاقت سے اس کے گھر کو جنت کا نمونہ بنا دے۔ تمہاری صغریٰ کام تو سب کرتی ہیں روٹی بھی پکاتی ہیں، جھاڑو بھی دیتی ہیں۔ برتن بھی مانجھتی ہیں کپڑے بھی سیتی ہیں اور بچہ کو بھی پالتی ہیں، لیکن افسوس یہ ہے کہ انہیں کسی کام کرنے کا نہ تو ڈھنگ ہے اور نہ وقت پر کام کرنے کی عادت اور فکر۔ ان کی بے فکری اور بے پروائی کی وجہ سے صدہا قسم کے نقصانات ہوتے رہتے ہیں۔ ان کے برتن میلے اور بدقلعی رہتے ہیں۔ ان کا مکان بالکل گندہ اور غلیظ رہتا ہے، اور ان کے اور ان کی بچی کے کپڑے ہمیشہ میلے کچیلے رہتے ہیں اور ان تمام باتوں کا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ اور نفیسہ آئے دن بیمار رہتی ہیں اور تیسوں دن ان کی ڈولی حکیم کے دروازہ پر کھڑی رہتی ہے۔ اگر روزانہ دوا کی قیمت کا اوسط آٹھ آنہ ہی ہو تو تب بھی ہر مہینے پندرہ روپے کی یہ رقم صرف ان کی سستی اور بے پروائی کی وجہ سے برباد ہوتی رہتی ہے اور وہ خود اور ان کی پیاری بچی جو مصیبتیں اور تکلیفیں بیماری کی وجہ سے جھیلتی ہیں وہ الگ۔ تمہارا ان کا دیوار بیچ کا ساتھ ہے۔ اتنی سی دور میں مکان کی آب ہوا تو نہیں بدل سکتی مگر خدا کا شکر ہے ہمارا گھر صاف رہتا ہی برتنوں پر قلعی بھی وقت پر ہوتی رہتی ہے آدمیوں کے بدن اور کپڑے بھی صاف رہتے ہیں اس لئے ہمارے گھر میں کبھی اتفاق ہی سے کوئی بیمار ہو جائے تو ہو جائے ورنہ برابر تندرست رہتے ہیں صبح کو وہ نو بجے کے قریب سو کر اٹھتی ہیں

اور جلدی جلدی بھاگم بھاگ ناصر کو کھانا وقت پر دینے کے لئے ہر ایک کام ادھورا اور بری طرح کرتی ہیں اور ایسی جلد بازی اور گھبراہٹ میں کھانا بھی بدمزہ اور براپکتا ہے اور برتن بھی بے شمار ٹوٹتے ہیں. مجھے معلوم ہے کہ وہ نماز پڑھتی ہیں مگر ایسی نماز سے کیا فائدہ کہ جب اس کا اصلی مقصد ہی جاتا رہے۔ صبح کی نماز اس لئے پڑھی جاتی ہے کہ انسان کو سویرے سے اٹھنے کی عادت پڑے اور وہ سست اور نکمانہ بننے پائے۔ دوپہر کو وہ پھر پڑ کے سو جاتی ہیں اور سوتی بھی ایسی ہیں کہ بس پھر شام ہی کی خبر لاتی ہیں۔ اب بتاؤ کہ گھر میں فرشتے تو آکر جھاڑو دینے سے رہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تمام گھر میں کوڑے کے انبار لگے رہتے ہیں، جھوٹے برتن پڑے سڑتے رہتے ہیں اور اتنا وقت بھی نہیں ملتا کہ دو لوٹے پانی اپنے بدن پر ڈال لیں یا بچی ہی کا سر دھلا دیں۔ اگر تم روزمرہ نفیسہ کے بالوں میں کنگھی نہ کردیا کرو تو چار ہی دن میں اس کے سر پہ ایسے جھنڈ کھڑے ہو جائیں کہ اس کی صورت سے ڈر لگے۔ جب وہ بچی کو ایسے حال میں رکھتی ہیں تو ظاہر ہے کہ خود بھی ایسی ہی گت سے رہتی ہونگی. اب ذرا تمہیں انصاف کرو کہ بیچارہ ناصر آخر انسان ہے، وہ کہاں تک اور کب تک ایک میلی پھوہڑ بھتنی سے محبت کرسکتا ہے. میں پھر بھی کہتا ہوں کہ ناصر نے اگر انہیں مارا تو بہت ہی برا کیا لیکن خدا کے لئے یہ بھی دیکھو کہ وہ غریب کہاں تک ضبط کرے اور کب تک اپنی گاڑھی کمائی کا سینکڑوں اور ہزاروں روپیہ ایک جنگلی درندے کے پالنے پر صرف کئے جائے

میں آج ہی ناصر سے گفتگو کر کے انہیں اچھی طرح سمجھا دوں گا لیکن اگر کسی طرح تم صرف اتنا کردو کہ صغریٰ میں تھوڑی سی بھی انسانیت آجائے تو میں سچ کہتا ہوں کہ برس کے برس دن گھر میں قیامت بپا ہونے کی بجائے ہر روز ان کے گھر میں عید رہا کرے۔

جمیلہ۔ اچھا تم انہیں سمجھاؤ اور میں جس طرح بھی بن پڑے گا صغریٰ کو انسان

بناؤں گی. تم ناصر صاحب کی آج شام کو دعوت کر دو اور میں ان کی بیوی اور بچی کو لے آؤنگی. یہیں دالان میں پردہ ڈال دیں گے اور ہم اپنے سامنے ایک دوسرے کی زبان سے دونوں کو آیندہ کے متعلق ان کے عہد سنوا کر آپس میں صفائی کرادینگے

عقیل۔ اچھی بات ہے۔

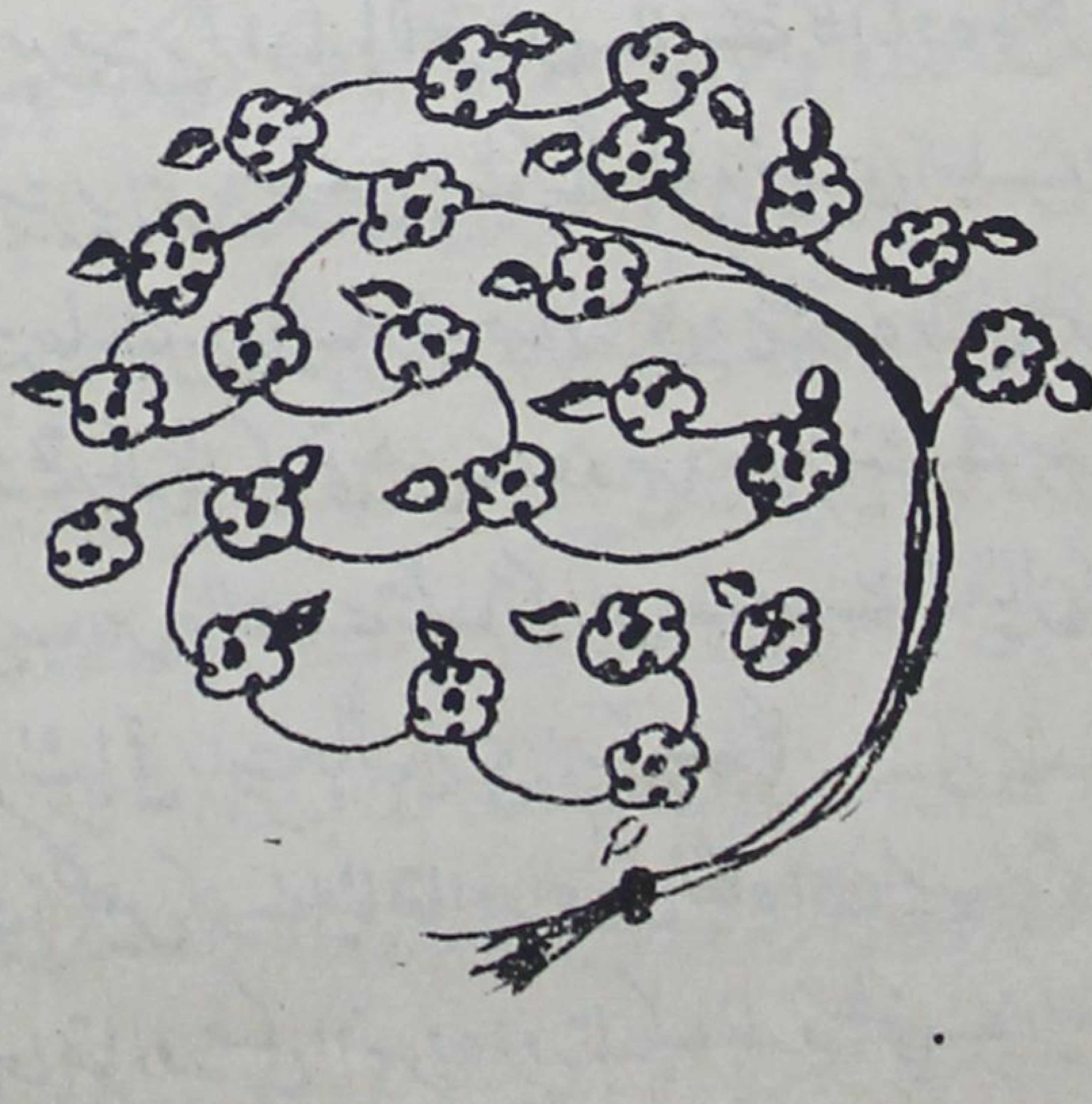
جمیلہ کی مسلسل کئی گھنٹے کی کوششیں بیکار نہ گئیں اور بالآخر ایک آہوئے وحشی کو رام کرنے میں اسے کامیابی ہو گئی۔ صغریٰ نے اپنی تمام کمزوریوں کا نہایت سچے دل سے اعتراف کیا اور آیندہ کے لئے ایک اچھی بیوی بننے کا خلوص دل سے ارادہ کرلیا. ناصر نے نہایت کھلے دل سے اپنے گزشتہ برتاؤ کی معافی مانگی اور جب وہ دونوں میاں بیوی رخصت ہونے لگے تو ناصر نے کہا کہ درحقیقت

میری شادی

آج ہوئی

ہے

(ختم)



تقدیر کی گردش

دہلی کے خیراتی شفاخانے کی ایک چارپائی پر پڑا ہوا بڈھا سکندر بخت شدت تکلیف سے کراہ رہا تھا۔ رات کے دو بجے کا وقت تھا۔ آس پاس کے تمام مریض پڑے غافل سو رہے تھے۔ بخار کی حدت اور پیاس کی شدت نے سکندر بخت کو بے تاب کر رکھا تھا اور وہ بار بار ایک عالم یاس میں چاروں طرف اس امید میں نگاہ دوڑاتا تھا کہ شاید کوئی خدا کا بندہ ایسا نظر آئے جو اسے دو گھونٹ پانی پلادے لیکن جب کوئی نظر نہ آتا تھا تو وہ انتہائی بے قراری کے ساتھ جلدی جلدی کروٹیں بدلنے لگتا تھا اور بے اختیار کراہنے کی دردناک آوازیں اس کے منہ سے نکلنے لگتی تھیں۔ اس نے کئی مرتبہ کوشش کی کہ خود اٹھے اور قریب ہی جو صراحی رکھی تھی اس میں سے پانی پی لے مگر سینہ کے شدید درد نے اسے کسی طرح نہ اٹھنے دیا۔ جب اس نے اٹھنے کے ارادے سے ذرا سی حرکت کی فوراً اس کے متورم پھیپھڑوں میں شدید درد ہو کر کھانسی اٹھی اور اسے بے حال کر کے پھر بستر پر گرادیا۔ بالآخر اس نے اٹھنے کا ارادہ بالکل ترک کر دیا اور خاموش ہو کر بستر پر اس امید میں لیٹ گیا کہ شاید نیند ہی آجائے اور تھوڑا وقت غفلت میں گزر جائے۔ دو ایک مرتبہ ذرا ذرا سی دیر کیلئے وہ غافل ضرور ہو گیا مگر وہ غفلت نیند کی نہ تھی بلکہ بخار کی تھی جس سے وہ ہر دو چار منٹ کے بعد چونک پڑتا تھا۔ تین بجے کے قریب اس حالت سے تنگ آ کر اس نے سونے کے خیال کو بھی چھوڑ دیا اور ارادہ کر لیا کہ اب باقی رات جاگ کر ہی بسر کرے گا۔

سکندر بخت آنکھیں کھولے لیٹا تھا اور اس کی نگاہ اس لیمپ پر جمی ہوئی تھی جو چھت میں ٹنگا ہوا تھا اور جس کی افسردہ اور تاریک نما روشنی نے اسپتال کے تمام

کمرے کو ایک عجیب بھیانک اور ڈراؤنی شکل دیدی تھی۔ اسے معلوم ہو رہا تھا کہ اُس کی زندگی اور تندرستی بھی بالکل اسی لیمپ کی طرح تھی جو روشن ہونے کے باوجود تاریک تھا اور جس سے روشنی اور نور نکلنے کی بجائے تاریک اور ہیبت ناک شعاعیں نکل رہی تھیں۔ اس کے دل میں یہ آرزو پیدا ہوئی کہ کاش اس لیمپ کی زندگی طرح میری زندگی بھی صبح تک ختم ہو جائے اور میں اس مصیبت سے نجات پا جاؤں۔ مرجانے کی تمنا نے اس کی آنکھوں کے سامنے دنیا کی بہت سی دلچسپیوں کو لاکر کھڑا کر دیا۔ اسے اپنی بوڑھی بیوی کا خیال آیا جس کا اس دنیا میں اس کے سوا کوئی والی وارث نہ تھا' اور بیوی کے ساتھ ہی بچے بھی یاد آئے جن کی عمریں سترہ اور بارہ سال کی تھیں۔ وہ ٹوٹی پھوٹی اور مکروہ کوٹھڑی یاد آئی جو اسے ایک شریف آدمی نے ترس کھا کر رہنے کے لئے دیدی تھی اور جسے وہ اپنا "گھر" سمجھتا تھا۔ کیا مجھے ان چیزوں کے لئے اس دنیا میں ابھی اور زندہ رہنے کی خواہش کرنی چاہیئے؟ اور کیا درحقیقت ایک دائم المریض بیوی دو فاقہ زدہ بچے' اور ایک ٹوٹی پھوٹی کوٹھری کہ جو اپنی ملکیت بھی نہ تھی' ایسی چیزیں ہیں کہ جن کے لئے زندہ رہا جائے؟ بار بار یہ سوالات.... پراگندہ دماغ میں چکر لگا رہے تھے اور وہ کسی طرح فیصلہ نہ کر سکتا تھا کہ دنیا کی دلچسپیوں کو اور بیوی بچوں کی محبت کو ترجیح دے یا اپنی مصیبتوں کے خاتمہ کو اس ابدی راحت کو جس کے بعد حشر تک پاؤں پھیلا کر سونے کے سوا اور کوئی تکلیف نہ تھی۔

میری زندگی! اس نے دل میں کہا' ہونہہ! یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ کیا ایک ایسی زندگی سے بھی کسی انسان کو محبت ہو سکتی ہے جو تکلیف اور مصیبتوں کے اتھاہ سمندر میں بسر ہو رہی ہو اور جہاں موت کے سوا اور کوئی ساحل نظر نہ آتا ہو۔ کیا موت کے اس قدر قریب پہنچکر کہ جو درحقیقت درد و آلام کے سمندر کا کنارہ ہے' میں پھر بھی آرزو کروں کہ بیچ سمندر میں واپس چلا جاؤں۔ کیا میں پھر اسی لئے دنیا میں رہنا

وہ یہ پسند کر لوں کہ صبح سے شام تک ایک ایک دروازے پر جا کر بھیک مانگوں اور لوگ پھر مجھ سے یہ جگر دوز الفاظ کہا کریں کہ "شہزادہ صاحب اس وقت تو معاف کیجئے، پھر کسی وقت آئیے گا۔" آہ! شہزادہ صاحب! شہزادہ صاحب! کس قدر تیر کی طرح دل میں چبھنے والا لفظ ہے! یہ لفظ میری عزت کرنے کے لئے نہیں بولا جاتا بلکہ اس سے میری توہین اور تذلیل مقصود ہوتی ہے۔ شہزادہ کہکر مجھے یاد دلایا جاتا ہے کہ تو دنیا کا وہ سب سے زیادہ بدنصیب انسان ہے جس کے باپ دادا تخت و تاج کے مالک تھے جس کے اسلاف تیس کروڑ انسانوں پر حکومت کرتے تھے، اور جس کے آبا و اجداد کے حضور میں بڑے بڑے بادشاہوں کے سر تعظیم کے لئے جھک جاتے تھے۔ آہ! مجھے یاد دلایا جاتا ہے کہ میں ان داداؤں کا نالائق اور سوختہ بخت پوتا ہوں جو سالگرہ کے موقعوں پر اپنے وزن کے برابر سونا تول کر خیرات کیا کرتے تھے، اور میرا اس خاندان سے تعلق ہے کہ جس کی شوکت اور عظمت کے نقش سب کچھ مٹ جانے پر بھی آج تک صفحۂ ہستی پر ثبت ہیں، اور آج بھی انہیں دیکھکر بڑے بڑے صاحبان افسر و دیہیم حالت استعجاب میں منہ کھولے کھڑے کے کھڑے رہ جاتے ہیں۔ آہ! سکندر بخت! میرا نام سکندر بخت رکھا گیا تھا؛ سچ ہے برعکس نہند نام زنگی کا فور۔ کیا مجھ سے بڑھکر بھی دنیا میں کوئی اور بدبخت ہو سکتا ہے؟ (کچھ سمجھ کر) ہاں اگر میں مر جاؤں تو میری عزیب بیوی مجھ سے بھی زیادہ بدقسمت ہوگی، آخر وہ بھی تو شاہی خاندان ہی سے ہے، اور میرے بچے! ان کا سلسلۂ نسب بھی تو شاہان مغلیہ ہی سے جا کر ملتا ہے (قہقہہ لگا کر) ایک گداگر یہ بھیک مانگنے والے بچے اور ان کا لقب شہزادے! یہ سب کچھ قسمت کی ستم ظریفی ہے۔ ہاں تو میں اگر مر گیا تو زینت آرا کیا کرے گی۔ اس بڑھاپے میں تو وہ اس قابل بھی نہیں ہے کہ کہیں کسی کے ہاں نوکری کر لے۔ اور کمبخت سلیمان شکوہ ہائے میں نے بھی نام رکھنے میں وہی غلطی کی۔ کچھ بھی بدھو، جما یا شبراتی نام رکھدیتا

سلیمان شکوہ سے تو صاف معلوم ہوجاتا ہے کہ وہ شاہی خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ بزرگوں کی توہین اس سے بڑھکر اور کیا ہوسکتی ہے کہ ان کی اولاد بھیک مانگتی پھرے اور لوگ انہیں "شہزادہ صاحب" کہکر بھیک دیں! افسوس۔ ایں چار بجگئے۔ یا اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ اب تو جلدی سے صبح ہو جائے گی

سکندر بخت کو انتقال کئے ہوئے چھ مہینے ہوچکے۔ اس کی بیوہ گیتی آرا اپنے لڑکے سلیمان شکوہ اور لڑکی جہاں آرا کے ساتھ ایسی تنگ و تاریک کوٹھری میں زندگی کے دن گذار رہی تھی جو بابو اسد اللہ ٹھیکہ دار نے سکندر بخت کے حال زار پر ترس کھاکر انہیں رہنے کے لئے دیدی تھی۔ سلیمان شکوہ کی عمر اب اٹھارہ سال کی تھی لیکن ایک حسین و خوبرو جوان ہونے کے باوجود اس کی لاغری اور کمزوری نے اس کے چہرے کو بالکل بدہیئت اور بے رونق بنا دیا تھا۔ جہاں آرا بھی اگر اس سے بہتر حالت میں پرورش پاتی تو لقیناً ایک نہایت ہی حسین و جمیل لڑکی ہوتی لیکن روز روز کے فاقوں اور آئے دن کی بیماریوں نے اس کی صورت کو بھی کچھ ایسا بگاڑ دیا تھا کہ دیکھی نہیں جاتی تھی۔ سلیمان شکوہ یا شہزادہ سلیمان شکوہ نے جب بہت کچھ دوڑ دھوپ کی اور در در مارا مارا پھرا تو اسے ایک شخص نے خدمتگاری کے لئے آٹھ روپے مہینہ اور کھانے پر نوکر رکھ لیا۔ آٹھ روپے میں دو آدمیوں کا کھانا اور تین آدمیوں کے کپڑے کسی طرح بھی نہ ہوسکتے تھے اس لئے ہمیشہ یہی ہوتا تھا کہ ماں بیٹی دونوں روکھی سوکھی کھاکر اپنا پیٹ بھر لیتی تھیں اور پھٹے چیتھڑوں میں پیوند پر پیوند لگا لگا کر تن ڈھکنے کی کوشش کرتی تھیں۔ گیتی آرا کو دق تو عرصہ ہوا ہوچکی تھی، اب اس تنگ، تاریک، اور مرطوب کوٹھری کی ہوا نے اور پھر سب سے زیادہ خاوند کے صدمہ نے اس کی حالت بالکل ہی خراب کردی اور

سکندر بخت کے بعد چھ مہینے کے اندر ہی اندر وہ چارپائی سے لگ گئی اور اس قابل بھی نہ رہی کہ اپنے آپ سے کروٹ بدل لے۔ بھولی اور کمسن جہاں آرا گھر کا بھی بہت کام کاج کرتی اور باقی وقت میں ماں کے سرہانے بیٹھکر اس کی خدمت بھی کیا کرتی۔

نومبر کا مہینہ تھا اور کسی قدر بارش ہوجانے کی وجہ سے سردی بہت ہی غیر معمولی طریقہ پر بڑھ گئی تھی۔ رات کو دس بجے جب سلیمان شکوہ سردی سے کانپتا ہوا کوٹھری میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ چھوٹی بہن سردی کی وجہ سے بالکل گٹھڑی بنی ہوئی ماں کے سرہانے بیٹھی ہے اور ماں اپنے پھٹے ہوئے دوپٹے سے اپنا بدن چھپائے زمین پر لیٹی ہوئی ہے۔ ماں کی حالت زار پر سلیمان شکوہ کو بڑا ترس آیا اور اس نے بہن سے کہا کہ جہاں آرا بہن آج تو بڑی سردی ہے تم نے دو ایک لکڑیاں ہی سلگا دی ہوتیں کہ امی کو کچھ تو گرمی پہونچتی۔

جہاں آرا۔ بھائی صاحب حضرت لکڑیاں گھر میں کہاں ہیں۔ آج اٹھائیس تاریخ ہے۔ جو کچھ آپ نے دیا تھا سب ختم ہو چکا۔ آج تو اس وقت روٹی بھی نہیں پکی ہے۔

سلیمان شکوہ۔ کیا تم بھی بھوکی ہو اور اماں بھی یونہی پڑی ہیں۔

جہاں آرا۔ جی ہاں۔

سلیمان شکوہ نے محبت سے بھری ہوئی نگاہیں ماں اور بہن پر ڈالیں اور سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اس کے اپنے پاس ایک پیسہ بھی نہ تھا اور جس شخص کے ہاں وہ ملازم تھا اس سے بھی کسی طرح امید نہ تھی کہ مہینہ ختم ہوئے بغیر کچھ دیدے گا۔ شہر بھر میں کسی سے ملاقات نہ تھی کہ کسی سے کچھ قرض مانگ لاتا۔ اس نے سوچا کہ یا اللہ ابھی تنخواہ ملنے میں دو دن باقی ہیں۔ ایک وقت کا فاقہ تو ان دونوں پر گذر چکا اور ابھی چار وقت اور باقی ہیں۔ یہ کس طرح زندہ رہیں گی۔ اس نے بہتیرا سوچا مگر کوئی اور تدبیر سمجھ میں نہ آئی سوائے اس کے کہ یا تو چوری کرے یا بھیک مانگے۔ اور یہ دونوں کام ایسے

تھے جن کے کرنے پر اس کا غیور دل اسے آمادہ نہ ہونے دیتا تھا۔ بالآخر وہ ایک آہ بھر کر اٹھا اور اس ارادہ سے گھر سے نکلا کہ بھیک مانگ کر کہیں سے کچھ لائے تاکہ ماں اور بہن کے پیٹ میں کچھ ڈال سکے۔ چونکہ اس سے پیشتر کبھی اسے ایسا سابقہ نہیں پڑا تھا اس لئے ایک ایک قدم من من بھر کا ہوگیا اور بہزار دقت وہ گھر سے نکل سکا۔

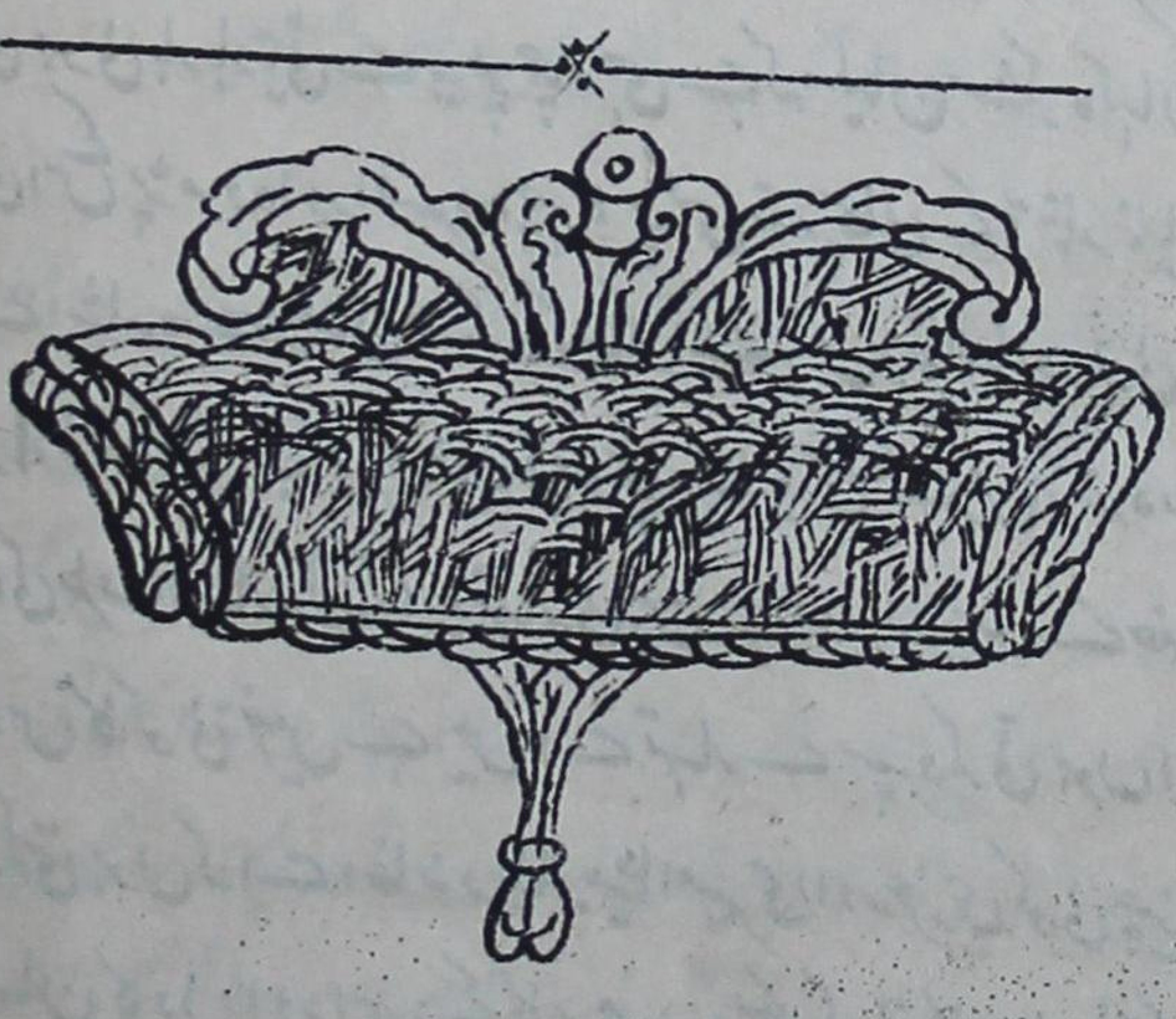
بھیک مانگنا بھی اب ایک مستقل فن گیا ہے اس لئے اکثر وہی لوگ محروم رہتے ہیں جو درحقیقت محتاج اور ضرورت مند ہیں کیونکہ عادت نہ ہونے کی وجہ سے وہ مناسب طریقہ پر بھیک نہیں مانگ سکتے اور ان کی بے شعوری اور بدسلیقگی دینے والے کو ان کے متعلق یہ یقین دلا دیتی ہے کہ وہ بدمعاش ہیں۔ سلیمان شکوہ بھی آداب فن سے ناواقف محض تھا، دوسرے یہ کہ رات بھی زیادہ ہو چکی تھی اس لئے جب رات کے بارہ بجے وہ لوٹ کر گھر پہنچا ہے تو اس کے پاس صرف ایک پیسے کے چنے تھے جو کسی شخص نے ترس کھا کر اسے دلا دیئے تھے۔ گھر پہونچکر اسے معلوم ہوا کہ جس ماں کا پیٹ بھرنے کی خاطر وہ رات کے بارہ بجے تک بھیک مانگتا پھرا وہ قریب المرگ حالت میں پڑی ہوئی بار بار بیٹی سے یہ پوچھ رہی ہے کہ سلیمان شکوہ کہاں چلا گیا۔ اسکے پہونچتے ہی اس کے پژمردہ اور افسردہ چہرہ پر کسی قدر بحالی کے آثار نمایاں ہوئے اور گیتی آرا نے اشارہ سے سلیمان شکوہ کو بلا کر اپنے پاس بٹھا لیا اور بولی

گیتی آرا۔ دیکھو بیٹا اب میرا وقت آپہونچا۔ شاید صبح تک میں زندہ رہ سکوں۔ (جہاں آرا کی طرف اشارہ کر کے) یہ تمہاری بہن ہے اور اب سوائے خدا کے یا تمہارے دنیا میں اس کا کوئی نہیں ہے۔ میں اسے تمہارے سپرد کرتی ہوں اور تم سے ہاتھ جوڑ کر کہتی ہوں کہ اسے دغا نہ دینا۔ بیٹا امیری اور غریبی کوئی چیز نہیں ہے اصل چیز انسان کا دل اور اس کے کام ہیں۔ دیکھو کوئی کام ایسا نہ کرنا کہ جس سے تمہارے بزرگوں کی روح کو شرم آئے۔ آج بے شک قسمت نے تمہیں

فقیر کر دیا ہے مگر جو خون تمہاری رگوں میں دوڑ رہا ہے وہ فقیروں کا نہیں ہے۔
پس اس خون کی لاج رکھ لینا اور ہمیشہ نیک سچے اور ایماندار رہنا۔ جہاں آرا اب
تیرہ برس کی ہے وہ بہت دنوں تک تمہارے پاس نہیں رہے گی اس لئے ایسا نہ
کرنا کہ اس کا دل میلا ہو اتنا کہتے کہتے گیتی آرا کی حالت غیر ہوئی اور پے در پے
دو تین ہچکیاں آکر اس کا کام تمام ہو گیا۔

سلیمان شکوہ نیک بھی ہے لائق بھی ہے اور ایماندار بھی لیکن جاہل مطلق ہونے
کی وجہ سے وہ بدستور خدمتگاری کر کے اپنا پیٹ بھرتا ہے اور جہاں آرا مغلیہ
خاندان شاہی کی شہزادی جہاں آرا کی شادی ایک گھوسی کے ساتھ ہو گئی
ہے جس کے گھر وہ دن بھر اُپلے تھوپا کرتی ہے یا گایوں اور بھینسوں کے لئے
سانی کیا کرتی ہے۔

وتلک الایام نداولھا بین الناس



بے گناہ کی بربادی

دہلی کی کچہری کے احاطہ سے انسانوں کا ایک جم غفیر نکلا۔ ان میں غریب بھی تھے اور امیر بھی مرد بھی تھے اور عورتیں بھی، اور بوڑھے بھی تھے اور بچے بھی۔ یہ سب کے سب مسلمان تھے اور صرف دس پانچ اشخاص کے سوا باقی سب کے چہروں سے دلی رنج و غم کا اظہار ہو رہا تھا۔ جو تھا سر جھکائے ہوئے اور مغموم تھا، اور جو باہر نکلتا تھا وہ ٹھنڈے سانس بھرتا اور آنسو پونچھتا نکلتا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سب کے سب کسی مرثیہ خوانی کی مجلس سے اٹھکر آرہے ہیں یا اپنے کسی قریبی عزیز کو دفنانے جارہے ہیں عورتوں کی حالت نسبتاً اور بھی زیادہ خراب تھی اور ان میں سے اکثر و بیشتر زار و قطار رو رہی تھیں۔

یہ تمام مجمع ان ملزموں کے رشتہ داروں اور دوستوں کا تھا جنہیں پولیس نے قاضی عبدالرشید مرحوم کی پھانسی اور تدفین کے روز بلوہ اور فساد وغیرہ کے الزام میں گرفتار کیا تھا، اور جنہیں عدالت نے بڑی سخت سزائیں دی تھیں۔ تمام ماخوذین میں بہت کم ایسے خوش قسمت ثابت ہوئے جو اپنی بے گناہی کا عدالت کو یقین دلا سکے اور بری ہو گئے ورنہ عام طور پر یہی ہوا کہ

جسے دیکھا حاکم وقت نے کہا یہ بھی قابل دار ہے

جس وقت یہ گرفتاریاں عمل میں لائی گئی تھیں اس وقت مجرم اور بے گناہ کی تمیز بہت ہی دشوار تھی اس لئے بہت سے ایسے بدنصیب بھی حوالات میں بھر دیئے گئے تھے جنہیں عبدالرشید کے جنازہ سے نہ کوئی تعلق تھا اور نہ دلچسپی، اور محض اپنے کسی خانگی کام کی وجہ سے اس وقت سڑک پر جارہے تھے۔ جہاں گرفتاریاں عمل میں آئیں۔ عدالت

میں جاکر مجرم و غیر مجرم کی تفریق اور بھی زیادہ دشوار ہوگئی کیونکہ اس بات کا ثبوت پہنچانا کہ فلاں وقت فلاں مقام پر ہماری موجودگی اس سبب سے تھی کوئی آسان کام نہ تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایسے غریب اور بے وسیلہ لوگ جن کے لئے دوڑ دھوپ کرنے والا کوئی نہ تھا اور بے نوا اور کم مایہ اشخاص جن کے پاس دل کھول کر صرف کرنے کے لئے روپیہ نہ تھا اپنی بریت کا کوئی معقول ثبوت مہیا نہ کر سکے اور سزایاب ہوگئے۔ سزائیں بھی جو ان لوگوں کو ملیں وہ کچھ معمولی نہ تھیں بلکہ ایسے ملزموں کی ایک خاصی معقول تعداد تھی جنہیں تھوڑے نہ بہت پورے تین سال کے لئے سرکاری مہمان بنا دیا گیا۔

سزا پانے والوں میں اگرچہ کچھ لوگ خوش حال اور متمول بھی تھے لیکن زیادہ تعداد انہی بدنصیبوں کی تھی جو روزانہ دن بھر کنواں کھود کر شام کو پانی پیتے ہیں، اور ان کی مفلسی نے جہاں ایک طرف ان کے لئے اپنی بے گناہی کے ثبوت کی فراہمی دشوار کر دی تھی۔ وہاں دوسری طرف یہ مصیبت بھی ڈال دی تھی کہ پردہ نشین بیوی اور چھوٹے چھوٹے بچوں کی پرورش کا کوئی ذریعہ نہ تھا، اور اسوقت تک غریب بیوی نے زیور فروخت کر کے یا کہیں سے قرض دام لے کر صرف اس امید پر گذارہ کیا تھا کہ اس کا شوہر جسے وہ یقین کے ساتھ جانتی تھی کہ بے گناہ ہے بری ہو جائے گا۔ عدالت کا فیصلہ ایک آخری مگر سب سے زیادہ کاری ضرب تھی، جو سزا یافتہ ملزموں کے بیوی بچوں کے دل پر لگی اور یہی وجہ تھی کہ اسوقت ان میں سے ہر ایک بے قرار اور اشکبار نظر آرہا تھا۔

اسی ہجوم میں غریب نیاز اللہ کی بے کس اور مظلوم بیوی بھی تھی جسے اپنے خاوند کی سزا کا حکم سنتے ہی عدالت میں غش آگیا تھا اور جو اب برقعہ میں لپٹی لپٹائی سب سے الگ روتی ہوئی گھر واپس جا رہی تھی۔ اسے معلوم تھا اور پورے یقین کے ساتھ معلوم تھا کہ اس کا خاوند بالکل بے گناہ ہے وہ خوب جانتی تھی کہ اس کا خاوند ایک بہت

ہی مرنجان و مرنج طبیعت کا ایماندار شہری ہے جسے اپنی محنت اور مزدوری کے سوا دنیا کے کسی کام سے کوئی واسطہ نہیں ہے' اسے علم تھا کہ نیاز اللہ کو عبد الرشید کے مقدمہ سے کبھی کوئی دلچسپی نہیں ہوئی تھی اور یہ کہ وہ اس خاص تاریخ کو جنازہ کی شرکت کے لئے قطب روڈ پر نہیں گیا تھا بلکہ بڑی کوشش سے اپنے کام سے کسی قدر فرصت حاصل کر کے اپنی بیمار بہن کی عیادت کے لئے صدر بازار کی طرف جارہا تھا کہ گرفتار ہوگیا۔ بدقسمتی سے وہ ان عورتوں میں بھی نہ تھی جو کچھ نہ کچھ کام جانتی ہیں اور اگر وقت پڑ جائے تو سلائی یا کشیدہ وغیرہ کے ذریعے سے اپنا پیٹ پال لیتی ہیں. وہ سینا اور کاڑھنا جانتی ضرور تھی لیکن نہ اتنا کہ اسے ذریعہ معاش بنا سکے' اور وہ کھانے پکانے کے فن سے واقف ضرور تھی لیکن نہ اس قدر کہ ماماگیری کی نوکری کرلے۔ وہ ایک اچھے خاصے شریف خاندان کی لڑکی تھی اور شادی کے بعد ایک عرصہ تک خوب فارغ البالی اور خوش حالی کی زندگی گذار چکی تھی مگر اب اسے قسمت کہہ لیجئے یا خود اپنی حماقت کہ عام مسلمانوں کی طرح ان میاں بیوی کی عادتیں بھی کافی مسرفانہ تھیں اور دونوں کے دونوں آنکھیں بند کر کے خرچ کرنے کے عادی تھے. دولت ہمیشہ ان ہی کے گھر وہنیں رہنا پسند کرتی ہے کہ جو اس کی قدر کریں اور اسے آڈ بھگت سے اپنے گھر رکھیں اور ان لوگوں سے ہمیشہ دور بھاگتی ہے جنہیں اس کی کوئی قدر نہ ہو اور جو اسے معمولی کنکر پتھر کی طرح ہر جگہ پھینک دینے کے عادی ہوں آمدنی سے اگر خرچ زیادہ ہو تو قارون کا خزانہ بھی خالی ہوسکتا ہے نہ کہ بیچارے نیاز اللہ کی مختصر سی پونجی۔ دو چار سال کسی قدر لطف و راحت سے بسر کرنے کے بعد میاں بیوی کی آنکھیں کھلیں اور انہوں نے دیکھا کہ تمام سرمایہ ختم ہوچکا ہے۔ اس صورت حال کا علاج ہی کیا تھا بجز اس کے کہ صبر و شکر کے ساتھ اسے برداشت کیا جائے۔ نیاز اللہ نے ایک کارخانے میں ملازمت حاصل کرلی اور اسوقت سے دونوں میاں بیوی

اپنی اسی مختصر سی آمدنی میں گذارہ کرنے کے عادی ہو گئے تھے۔

زینب یعنی نیاز اللہ کی بیوی اپنے دو سال کے بچے کو گود میں لئے آہستہ آہستہ بھیڑ سے الگ الگ جا رہی تھی۔ رنج اور غم نے اس کی چال میں لڑکھڑاہٹ پیدا کر دی تھی اور وہ پاؤں رکھتی کہیں تھی اور پڑتا کہیں تھا۔ وہ چاروں طرف اپنی خیالی آنکھیں دوڑاتی تھی مگر کوئی شخص اسے ایسا نظر نہ آتا تھا جو اس مصیبت کے وقت اس کا شریک ہو سکے۔ رشتہ داروں میں دو چار دور کے رشتہ دار موجود ضرور تھے لیکن وہ سب ایسے ہی تھے کہ اگر زینب کے پاس کچھ موجود ہو تو اسے بھی لوٹ کر کھا جائیں۔ زیور بہت کچھ تو مقدمہ کی پیروی کی غرض سے بک چکا تھا اور جو کچھ باقی تھا وہ صرف اتنا تھا کہ زیادہ سے زیادہ دو چار مہینہ کا کام چل جائے تین سال کی طویل مدت ایک ایسا پہاڑ تھی جسے عبور کرنے کا اس کے پاس کوئی ذریعہ نہ تھا اور جس قدر زیادہ اس کے متعلق سوچتی تھی اسی قدر دماغ اور بھی مختل ہو جاتا تھا۔ اسے قطعاً خبر نہ تھی کہ وہ کہاں جا رہی ہے اور اگر وہ تھوڑی دیر میں گھر پہنچ گئی تو اس کا سبب صرف یہ تھا کہ اس کے پیروں کو سوائے گھر کے اور کہیں جانے کی عادت ہی نہ تھی۔

صبح کی بھوکی پیاسی زینب گھر پہونچتے ہی نڈھال ہو کر چارپائی پر گر پڑی اور اب پھر ایک مرتبہ آنسوؤں کا سیلاب امنڈ آیا۔ وہ روئی اور خوب ہی جی بھر کر روئی جب رو چکی تو آنکھیں بند کر کے اُس نے سوچنا شروع کیا کہ یا اللہ اب میں کیا کرونگی مکان کا کرایہ کہاں سے آئے گا اور اگر کرایہ نہ پہنچنے پر مکاندار نے نکال دیا تو کہاں جاؤں گی۔ مجھ بدنصیب کو تو کوئی کام بھی نہیں آتا کہ اسی سے دو روٹیاں مل جایا کریں سوچتے سوچتے اسے خیال آیا کہ مسلمانوں میں ایسے ایسے امیر آدمی اور سینکڑوں ہزاروں ہیں جو اگر چاہیں تو مجھ جیسی پچاسوں مصیبت زدہ عورتوں کی پرورش ہو سکتی ہے۔ مگر اس کا جواب ایک ٹھنڈا سانس بھر کر خود ہی اس کے دل نے دیدیا کہ اگر مسلمانوں کو

اپنی قوم کا اتنا درد ہوتا تو پھر رونا ہی کس بات کا تھا مسلمان غریبوں میں تو اتنا سکت ہی کہاں ہے کہ وہ کسی دوسرے کی مدد کر سکیں اور مسلمان امیروں کو اپنے عیش و آرام سے اتنی فرصت نہیں کہ کسی اور کی طرف توجہ کر سکیں۔ یکایک کسی خیال سے کانپ کر اس نے کہا" تو کیا اب میں بھیک مانگوں!! میرے اللہ مجھ سے تو کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلایا جائے گا۔ خدا جانے ان نگوڑی عورتوں کا کیسا دیدہ ہوتا ہے جو بازار میں ہر کسی کے سامنے اپنا دکھڑا رونے لگتی ہیں اور بھیک مانگ لیتی ہیں۔ بھیک مانگنے سے تو مرجانا اچھا ہے۔ آخر اب اس دنیا میں جی کر کرنا ہی کیا ہے۔ تین برس! (کانپ کر) تین برس کس نے دیکھے ہیں۔ میں بھلا اتنے دنوں تک کس طرح زندہ رہ سکتی ہوں۔ نہیں اب کبھی ان سے ملاقات نہیں ہو سکتی۔ تو پھر جب مرنا ہی ہے تو تھوڑے دنوں تک بھی کیوں مصیبت جھیلوں۔ زیور بیچ کر چار چھ مہینے برے حالوں اگر میں جیتی بھی رہی تو فائدہ کیا۔ تین برس تو کسی طرح پورے نہیں ہو سکتے۔ کچھ کام آتا ہوتا تو ضرور کر لیتی مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔ بھیک تو میں ہرگز نہیں مانگوں گی۔ اور مانگوں گی کیا نہیں مجھ سے مانگی ہی نہ جائے گی، تو پھر یہی مناسب ہے۔ اس رات کو مسجد کے کنوئیں میں کود پڑوں۔ بس یہ سب سے آسان ترکیب ہے۔ جو زندگی اب سامنے نظر آرہی ہے اس سے مرجانا ہزار درجہ اچھا ہے"!

اس فیصلہ پر پہونچتے ہی اس نے آنکھیں کھولیں۔ اور اٹھکر گھر کی ایک ایک چیز کو حسرت و یاس کی نگاہوں سے دیکھنا شروع کیا۔ وہ اپنے بکس کی چیزیں نکال نکال کر دیکھ رہی تھی کہ اسے یکایک اس میں ایک تصویر ملی۔ یہ تصویر نیاز اللہ کی تھی جو اس نے اپنی شادی کے موقعہ پر کھچوائی تھی۔ تصویر نے جذبات کو پھر ٹھیس لگادی اور دیوانوں کی طرح اس نے اسے کبھی کلیجہ سے لگانا اور کبھی پیار کرنا شروع کیا۔

"اب تم مجھے کہاں ملوگے۔ تین برس بعد جب تم خیریت سے آؤ گے تو تمہیں معلوم

ہو گا کہ زینب مرچکی۔ تمہیں رنج تو ہو گا۔ ہاں ضرور ہو گا۔ مگر میں کیا کروں۔ میں مجبور ہوں نہیں تو ہرگز تمہیں رنج نہ پہنچاتی۔ تمہیں خدا زندہ رکھے اور خوش رکھے۔ مگر تمہاری تصویر میرے ساتھ کنوئیں میں جائے گی"۔

اتنے میں بچہ کے رونے کی آواز آئی۔ زینب اتنی دیر تک بچہ کو بالکل بھول گئی تھی اسے خیال بھی نہ رہا تھا کہ اس کا ایک بچہ بھی ہے۔ رونے کی آواز کان میں پڑتے ہی مامتا نے زور کیا اور وہ سب چیزوں کو چھوڑ چھاڑ دوڑی ہوئی صحن میں گئی اور بچہ کو سینہ سے چمٹا کر پیار کرنا شروع کیا۔

اب پہلی مرتبہ اسے خیال آیا کہ اگر میں مرگئی تو اس بچہ کا کیا حشر ہو گا۔ اس مختصر سے جسم کو اس نے کلیجہ سے لگا کر خوب بھینچا۔۔۔۔۔۔ اور آخر میں پیار کر کے بولی "نہیں میرا بچہ! میں تیری خاطر جیونگی اور ضرور جیونگی۔ اپنے لال کو جس طرح بھی ہو سکے گا پالونگی۔ میں مرگئی تو بھلا تجھے کون پالے گا"؟

ؕ

مصیبت کبھی تنہا نہیں آیا کرتی اور ہمیشہ یہی دیکھا گیا ہے کہ جہاں انسان کسی ایک پریشانی میں مبتلا ہو تو پھر پریشانیوں اور دقتوں کا ایک لا متناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ زینب کو مبتلائے مصیبت ہوئے آج صرف تیسرا روز ہے رات کے بارہ بج چکے ہیں۔ مگر ابھی تک اس کی آنکھوں میں نیند کا کہیں پتہ نہیں۔ اس کا بچہ اس کے پہلو میں غافل سو رہا ہے مگر وہ ہر چند چاہتی ہے اور ادھر ادھر کروٹیں بدلتی ہے مگر کسی طرح نیند نہیں آتی۔ خیالات کی ایک بھیانک اور مہیب دنیا اس کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ اور مایوسیوں کے کالے کالے پہاڑ اسے سر بفلک کشیدہ سامنے نظر آرہے ہیں۔ اور وہ ان سے گھبرا گھبرا کر منہ پھیر لیتی ہے۔ ایک بجے کے قریب خدا خدا کر کے اس کی آنکھ لگی اور ابھی شاید اسے سوئے ہوئے بمشکل گھنٹہ بھر ہوا ہو گا کہ

کسی نے اسے جھنجھوڑ کر جگایا۔ گھبرا کر اس نے آنکھ کھولی تو دیکھا کہ ایک شخص کالا بھجنگ صرف ایک لنگوٹا باندھے اور منہ پر ڈھاٹا چڑھائے اس کے بچہ کو گود میں لئے کھڑا ہے اضطراری طور پر مامتا کی وجہ سے اس کے ہاتھ بچہ کی طرف بڑھے مگر وہ شخص کسی قدر پیچھے ہٹ گیا اور ایک بڑی سی چھری دکھا کر بولا۔

چور۔ اگر بچہ کی خیریت چاہتی ہے۔ تو چپکے سے سب زیور اتار کر مجھے دیدے اگر تو نے ذرا بھی دیر کی تو میں یہ چھری اس کے پیٹ میں بھونک دوں گا۔

زینب کو بچہ تو پیارا تھا ہی مگر ان حالات میں زیور بھی کچھ کم عزیز نہ رہا تھا۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں اور دکھتے ہوئے دل سے اس نے جلدی جلدی تمام زیور اتارا اور اس شخص کے سامنے رکھدیا جو اس کے بچہ کے لئے ملک الموت بنا کھڑا تھا۔ چور نے وہ سب چیزیں قبضہ میں کیں اور اس کے بعد بچہ کو چارپائی پر لٹا کر اور یہ کہکر چلدیا کہ "اگر تم چیخیں یا چلائیں تو خواہ میں پکڑا ہی کیوں نہ جاؤں۔ مگر میں آکر تمہارے بچہ کو ضرور مار ڈالوں گا"۔

ماں ایسا دل کہاں سے لاتی کہ اس کے بچہ کی جان خطرہ میں پڑ جائے، زینب خاموش رہی اور چور نہایت اطمینان کے ساتھ گھر میں جھاڑو دیکر چل دیا۔ اور اس طرح وہ تھوڑا سا سہارا بھی جاتا رہا جس سے زینب چار چھ مہینے گذار لیتی۔ نیند پہلے ہی مشکل سے آئی تھی تو بھلا اب اس حادثہ کے بعد کیا آتی۔ خدا کی بندی نے اسی طرح جاگ جاگ کر اور رو رو کر صبح کر دی۔

صبح ہوتے ہی اب یہ فکر کہ کھانے کو کہاں سے آئے۔ گھر میں ذرا سا آٹا موجود تھا اسے گوندھ کر اور ذرا سا گھی ڈال کر اس نے ایک ٹکیہ بچے کے لئے پکا دی اور خود اسی طرح منہ باندھے بیٹھی رہی۔ گھر میں کھانے کو موجود ہو اور آدمی ایک دو وقت نہ کھائے تو کچھ بات نہیں ہے لیکن یہ معلوم ہونے کے بعد کہ کھانا میسر ہی نہیں آسکتا

اس کی خواہش اور نہ ملنے کی تکلیف بہت بڑھ جاتی ہے۔ زینب کو بھی پیٹ میں آگ سی لگی ہوئی معلوم ہوتی تھی اور ضعف اس قدر غالب ہو گیا تھا کہ لیٹنے کے بعد اٹھکر بیٹھنا بھی برا معلوم ہوتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اٹھتی اور پانی کے دو چار گھونٹ پی لیتی۔ اور پھر لیٹ جاتی۔ اسی طرح شام اور شام سے پھر دوسری صبح ہو گئی۔ اور اب حقیقتاً وہ اس قدر نڈھال ہو چکی تھی کہ بچے کے لئے ٹکیہ پکانی بھی اسے دشوار ہو گئی بچہ کو ٹکیہ کھلا کر اس نے ایک گلاس بھر کر پانی پیا۔ خالی پیٹ میں پانی تیر کی طرح جا لگا اور جی متلانے لگا۔ وہ فوراً چارپائی پر لیٹ گئی۔ مگر جی متلانا نہ رُکا اور آخر کار اُسے بڑے زور سے قے ہوئی استفراغ کے باعث سے وہ اور بھی ہلکان ہو کر پڑ گئی اور بہت دیر تک ایک ایسی حالت میں پڑی رہی جسے نہ سونا کہا جا سکتا ہے اور نہ بیہوشی دوپہر کے قریب جب وہ جاگی یا اُسے ہوش آیا تو اُس نے حالات پر از سر غور کرنا شروع کیا اور بہت دیر تک سوچتے رہنے کے بعد وہ اٹھی برقعہ اوڑھا اور بچہ کو گود میں لیکر جہاں تک اس سے پھر اگیا شہر میں ماری ماری پھری کہ شاید کہیں کھانے پکانے کی نوکری مل جائے لیکن نوکریاں اس قدر جلدی سے بالعموم نہیں ملا کرتیں۔ دوروز کے فاقہ کی ماری اور دن بھر کی تھکی ہاری خدا جانے کس طرح وہ گھر تک آئی لیکن گھر پہنچتے ہی کچھ اس طرح چارپائی پر گری کہ پھر نہ اٹھی۔

دوسرے روز اہل محلہ کو کسی طرح معلوم ہوا تو لوگوں نے جا کر دیکھا کہ زینب کی لاش پلنگ پر پڑی ہے اور اس کا بچہ جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر اس کو اٹھا رہا ہے ۞

(۞)

عذرا کی سرگذشت

عذرا نے آنکھ کھولی تو ماں کا پکھوا چھوٹ چکا تھا، باپ غریب اور ماں کے رکھ رکھاؤ سے قطعی ناآشنا، بن ماں کی بچی پلی بڑھی اس طرح جس طرح لاوارث بچیاں پرورش پاتی ہیں، باپ نے اپنی بساط کے موافق عذرا کے نازونخرے برداشت کرنے میں کسر اٹھا نہ رکھی، اب یہ ننھی سی بچی اس قابل ہوگئی تھی کہ برے اور بھلے میں تمیز کر سکے، محلہ میں آمدورفت شروع ہوگئی، باپ دن بھر دفتر میں رہتا اور عذرا محلہ میں، شام کو جب اس کا باپ دفتر سے آتا تو یہ اس کے وقت سے پہلے گھر میں موجود رہتی۔

عذرا اب جوان ہو چکی ہے، اور رشید کو اس کی شادی کی فکر ہے، عذرا کے لئے مختلف رقعہ آئے مگر رشید کو سب ناپسند، آخر ایک رقعہ جو آگرہ کے ایک پنشنر رسالدار کا تھا، رشید نے پسند کیا، اور رجب کی ۱۳ تاریخ عذرا کے نکاح کے لئے مقرر ہوئی۔ رسالدار کی عمر اسوقت ۶۰ سال کی تھی، ساٹھا پاٹھا مشہور ہے، رسالدار کی تو فطرتاً یہ خواہش ہونی چاہیے کہ وہ کسی حسین اور دوشیزہ لڑکی سے شادی کریں، مگر نہ معلوم رشید کی عقل پر کیا پتھر پڑے کہ اس نے اپنی لڑکی کو جیتے جی جہنم میں دھکیل دیا اور عذرا سے دریافت کئے بغیر اسکی خواہشات کا خون کر دیا۔

رسالدار خضاب لگائے صاف ستھرے کپڑے پہنے دہلی کے مشہور قاضیوں کے محلہ میں ایک وسیع مکان میں مع چند احباب کے رجب کی ۱۳ تاریخ کو دولہا بنے بیٹھے ہیں۔ قاضی صاحب آئے، ۲۵ ہزار کا مہر باندھا گیا، اور ایجاب و قبول کے بعد غریب عذرا رسالدار شہنواز کے سپردگی میں دیدی گئی۔

رسالدار کے پاس عذرا کو رہتے کئی مہینے ہوگئے، مگر جو خوشی و مسرت ایک دلہن کو اپنے دولہا سے ہوتی ہے اس سے بدنصیب عذرا کوسوں دور تھی' اس کے گلاب سے رخسار کنیر کی طرح زرد ہو رہے تھے' بدن کی گدازگی اور لوچ رخصت ہوچکا تھا' اسکی جوانی کی تمام امنگوں کا خون ہوچکا تھا' اس کو اس وقت خاوند کی ضرورت تھی' نہ کہ باپ کی' وہ رسالدار کے پنجرے میں ہر چند پھڑ پھڑائی مگر ہمارا موجودہ تمدن اس کی ہرگز اجازت نہ دیتا کہ وہ اس قفس سے آزادی حاصل کرے۔

رسالدار غریب ہر طرح خاطر و مدارات کرتا' کھانے پینے اور خرچ کی کمی نہ تھی' مگر عذرا اپنے عنفوان شباب کے لئے جو چاہتی تھی وہ رسالدار کے قبضہ میں نہ تھا' ساون کے مہینہ میں جبکہ محلہ کی کنواری اور بیاہیاں جھولا جھول رہی تھیں اس کے دلمیں ہوک اٹھی اور کلیجہ تھام کر رہ گئی۔ کوٹھری میں گئی' کچھ سوچا' اور باہر آئی' آسمان کیطرف نگاہ اٹھا کر دیکھا اور کہا مجکو معلوم ہے کہ خودکشی گناہ کبیرہ ہے' مجکو علم ہے کہ قتل گناہ عظیم ہے لیکن دل کی حالت اس درجہ پہنچ گئی ہے کہ جان جیسی پیاری چیز کو اس قیدخانہ سے نجات حاصل کرنے کے لئے قربان کرتی ہوں' عورت ہوں' جوان ہوں' پہلو میں دل ہے۔ اور دلمیں ارمان ہے۔ میری حالت تجھ سے پوشیدہ نہیں' تو آقا میں لونڈی تو مالک میں کنیز' اب زندگی وبال ہے' خودکشی نہیں آزادی ہے' یہ کہکر عذرا نے افیون کا ایک بڑا انٹا ڈبیہ میں سے نکالا اور نگل گئی۔ اینٹھن شروع ہوئی۔ اور عذرا نے کروٹیں بدلنی شروع کیں' اور چند منٹ لوٹ پیٹ کر عذرا نے آنکھیں بند کیں' اور ایک ہچکی نے عذرا کی ناشاد و نامراد زندگی کا خاتمہ کر دیا۔

کیا نکاح کو سنت رسول سمجھنے والے مسلمانوں کیلئے عذرا کی اس موت میں کوئی درس عبرت ہے اور روزمرہ مسلمان لڑکیوں کے جذبات کا خون کرنیوالے مسلمان اس اندوہگیں حادثہ سے کچھ سبق لینگے۔ نکاح یقیناً سنت رسول' مگر وہ نکاح ہرگز شرعی نکاح نہیں ہوسکتا جسمیں بے زبان لڑکی سے مشورہ نہ لیا جاوے

احساسِ فرض اور محبت

احمد آباد کی تجارتی اور صنعتی کشش نے تمام ہندوستان کے سرمایہ داروں اور مزدوروں کو جمع کرنا شروع کر دیا تھا، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ احمد آباد کی آبادی اس قسم کے تارکانِ وطن سے زیادہ بڑھ گئی۔ اور شہر کے اصلی باشندوں سے ان مہاجرین کی نو آبادیاں، تعدادِ نفوس، تمول محنت اور تعلیم کے لحاظ سے بڑھ گئیں۔

احمد آباد کے جنوبی حصہ میں ہمارے دوست عابد حسن بھی رہتے تھے جن کا اصلی وطن دراصل سی پی کا ایک گمنام قصبہ تھا۔ مگر ان کو احمد آباد میں بود و باش اختیار کئے ہوئے بیس سال کا عرصہ ہو چکا تھا۔

احمد آباد میں آتے ہی وہ وکٹوریہ ملز کمپنی لمیٹڈ میں ایک محرر کی حیثیت سے ملازم ہوئے مگر رفتہ رفتہ اپنی دیانتداری، ہوشمندی، تجربہ کاری، معاملہ فہمی کی بدولت اس کپڑے کے مل کے مینیجنگ ڈائرکٹر ہو گئے۔

عابد حسن اپنی نیک نیتی اور خوش خلقی اور حسنِ انتظام کی وجہ سے وکٹوریہ ملز کے لیبرز میں کافی سے زیادہ ہردلعزیز تھے اس لئے مزدوروں کی محنت سے ہر سال معقول نفع ہوتا۔ اور حصہ داروں کے سرمایہ میں اضافہ کے ساتھ عابد حسن کے تمول میں بھی ترقی ہوتی گئی۔

عابد حسن کی عمر کا ابھی چالیسواں ہی سال تھا کہ احمد آباد میں پلیگ کی کثرت ہوئی اور چند لمحوں میں اس منتظم، دیانت دار ہستی کا خاتمہ ہو گیا جس کی زندہ یادگار ایک لڑکا سزا ہمد حسن اور ایک لڑکی ساجدہ تھی۔

زاہد حسن کی عمر اس وقت پچیس سال کی تھی اور ساجدہ ابھی انیسویں سال میں تھی کہ باپ کی جدائی کا صدمہ اٹھانا پڑا۔

عابد حسن صاحب نے اپنے دونوں بچوں کی تربیت زمانہ کی موجودہ رفتار کیمطابق کرائی تھی۔ اوران کی تعلیم کا بھی خاص انتظام کیا تھا۔

زاہد نے علاوہ عربی فارسی اردو گجراتی کے انگریزی میں ایف اے پاس کیا تھا اور ساجدہ نے انگریزی اسکول میں مڈل نہایت کامیابی کے ساتھ پاس کیا تھا۔ ساجدہ کو خدا نے سیرت کے ساتھ حسن صورتی سے بھی آراستہ کیا تھا۔ وہ اس زمانہ میں قدرت کی بہترین پیداوار سمجھی جاتی تھی۔ انگریزی تعلیم نے اس کو پردہ کی قیود سے آزاد کر دیا تھا اور اس لئے اس کے زہد شکن حسن سے بے محابا ہر وہ شخص لذت اندوز ہوتا تھا جس کو خدا نے اپنی صنعت کے دیکھنے کے لئے آنکھیں اور سینہ میں درد اور دل میں نیاز عطا کیا ہو۔

احمد آباد کے جنوبی حصہ میں جہاں ہمارے دوست عابد حسن کا مکان تھا اس کے قریب وکٹوریہ ملز کمپنی کے مزدوروں کا جمعدار محمد اصغر رہتا تھا اس کا ایک لڑکا محمد یوسف نہایت خوشرو سڈول بدن گورا رنگ چمکدار اور مخمور آنکھیں، درمیانہ قد انٹرنس پاس تھا۔ محمد یوسف مزدوروں میں غیر معمولی طور پر ہر دلعزیز تھا وہ اپنے باپ کے ساتھ روزانہ مل میں جاتا اور مزدوروں کی خستہ حالی کو بنظر غور دیکھتا۔ اوران کی تباہ حالی پر گھنٹوں غور کرتا آخر اس نے مل کے مزدوروں کو چھٹی کے وقت یہ بتانا شروع کیا کہ تمہاری اجتماعی قوت کیا ہے۔ اور تم اگر اپنے حقوق طلب کرو تو اس کے لئے کس قدر طاقتور ذرائع موجود ہیں اور دیگر ممالک میں طلب حقوق کی جدوجہد کس رفتار سے جاری ہے اور اس کے ساتھ ہی یوسف نے انگلستان کی مزدور جماعت کی رفتار ترقی اور اسکی بالشویک جماعت کی جدوجہد کا بغور مطالعہ کرنا شروع کیا۔

جس قدر یوسف کا اثر مزدوروں میں بڑھتا جاتا تھا۔ اسی قدر ارباب اقتدار اس سے خائف ہوتے جاتے تھے وہ دل سے چاہتے تھے کہ کسی طرح یوسف کارخانہ کے احاطہ میں قدم نہ رکھے۔ مگر یوسف کے اخراج کا حکم دینے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ اس لئے خون کا گھونٹ پی کر خاموش ہو جاتے تھے۔

محمد یوسف نے کارخانہ کی دس سالہ جوبلی کی تعطیل کے موقعہ پر تمام مزدوروں کو کارخانہ کے صحن میں جمع کر کے حسب ذیل تقریر مسکرا مسکرا کر شروع کی۔

مزدور بھائیوں!

آج ہمارے کارخانہ کی دس سالہ سالگرہ ہے۔ یوں سمجھو کہ اس کارخانہ کو ہمارا خون چوستے ہوئے آج پورے دس سال ہو گئے۔ میری آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ اس کارخانہ کے اصلی مالکوں (مزدوروں) کو جن کی محنت سے یہ کارخانہ اور اس کی تمام مشینری قائم ہے۔ پیٹ بھر کر کھانے کو نہ ملے۔ اور وہ مغرور سرمایہ دار جن کے چند روپے اس کارخانہ کی تعمیر میں صرف ہوتے ہیں مزدوروں کی محنت سے کمائے ہوئے روپے کی بدولت عیش اڑائیں۔ تمہارے بچے ایک ایک پیسے کو ترستے ہیں۔ اور ان کی اولاد روپے کو ٹھیکری سمجھتی ہے۔ تمہارے بدن پر پھٹے پیوند لگے کپڑے ہوتے ہیں اور ان کا لباس فاخرہ ہوتا ہے۔ ان سرمایہ داروں کو یہ نعمت اور عزت صرف تمہاری محنت کی بدولت حاصل ہے۔ تمہاری مزدوری کا تقرر ان کے رحم پر ہے وہ جو چاہیں تمہاری محنت کا معاوضہ تجویز کر سکتے ہیں۔ اور تم کو اف تک کرنے کی جرأت نہیں ہو سکتی۔ مغرور مینیجنگ ڈائرکٹر جو تمہارے کمائے ہوئے روپے سے تنخواہ پاتا ہے تمہارے ساتھ جانوروں کا سلوک کرتا ہے۔ مینیجر کو اور حصہ داروں کو درست کرنے اور ان تکالیف کا خاتمہ کرنے کا ایک ہی علاج ہے، اور وہ یہ کہ تم اپنی طاقت کو سمجھو، اور دیکھو کہ دنیا میں آجکل حقوق کس طرح طلب کئے جاتے ہیں۔

بھائیو!

خوب یاد رکھو کہ بغیر مانگے ماں بھی بچہ کو دودھ نہیں پلاتی. مگر کیا بھیک مانگنے سے حق ملتا ہے؟ ہرگز نہیں گداگری کا طریقہ مٹ رہا ہے. حقوق حاصل کئے جاتے ہیں اور اگر تم زندہ رہنا اور ترقی کرنا چاہتے ہو تو تم کو اپنا حق طاقت کے ذریعہ حاصل کرنا چاہیئے۔ بھیر آج تم مجھ سے صاف صاف کہدو کہ عزت کی زندگی چاہتے ہو یا ذلت کی موت. عزت کی زندگی تم سے کچھ قربانی اور ایثار بھی چاہتی ہے۔

اس تقریر نے کارخانہ کے دس ہزار مزدوروں میں اک آگ لگا دی. ہر طرف سے یہ صدا بلند ہوئی کہ اے نیکی کے فرشتے جو تو کہے گا۔ اس پر عمل کرنا ہم اپنا فرض سمجھیں گے آگے بڑھ، اور ہم کو حکم دے. یوسف اپنی تقریر کی کامیابی سے مسرور ہوا اور اس نے پھر مسکرا کر کہا۔

میری جان سے زیادہ عزیز بھائیو!

میں خوش ہوں کہ تم نے آج یہ بتا دیا کہ تم دس ہزار زندہ انسان ہو خوب یاد رکھو کہ زندہ انسان کو دنیا کی کوئی طاقت ٹھوکر نہیں لگا سکتی. مگر مردوں کی ہڈیاں ہمیشہ ٹھوکروں سے روندھی جاتی ہیں. بس یہ ناممکن ہے کہ دس ہزار زندہ انسان جو فیصلہ کریں اسے چند سرمایہ دار ٹھکرا سکیں۔

میرے بھائیو!

تمہارا استقبل تمہارے ہاتھ میں ہے بس میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ آج ان مغرور سرمایہ داروں کے سامنے یہ اعلان کر دو کہ جب تک کارخانہ کے ڈائرکٹروں میں مزدوروں کا کوئی نمایندہ نہ ہوگا اور موجودہ اُجرت میں بیس فیصدی کا اضافہ نہ ہوگا ایک مزدور بھی کارخانہ میں داخل نہ ہوگا. خوب یاد رکھو کہ یہ اعلان ایک مقدس حلف ہے یہ حلف ایک اعلان جنگ ہے جس کا آغاز آج سے اور اسی وقت سے ہوگا بس

کیا تم اس اعلان کے لئے تیار ہو؟ کیا تم اس راستہ میں مشکلات برداشت کر کے مصائب اٹھاؤ گے؟

دس ہزار انسانوں کے سمندر میں پھر جوش کی ایک لہر اٹھی اور متفقہ آوازیں آئیں کہ ہم تیار ہیں تیار ہیں۔

اس تقریر کے خاتمہ کے بعد مل کے تمام ہندو مسلمان مزدوروں نے ہڑتال کا اعلان کر دیا۔ اور دس سالہ جوبلی کے دوسرے روز سے کارخانہ کی حفاظت کے لئے پولس کا گارد طلب کیا گیا۔ اور مزدوروں نے مل میں آنے اور کام کرنے سے اس وقت تک انکار کر دیا جب تک کہ ان کے مطالبات تسلیم نہ کر لئے جائیں۔

•••

مولانا عابد حسن صاحب کی نیکی، دیانت داری اور حسن انتظام کا سکہ تمام ڈائرکٹروں اور حصہ داروں پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس لئے ان کی خدمات کے اعتراف کے طور پر وکٹوریہ ملز کا مینجنگ ڈائرکٹر ان کے بڑے لڑکے زاہد حسن کو سات سو روپیہ ماہوار پر مقرر کیا گیا زاہد کی عادتیں بگڑی ہوئی تھیں خرچ کرنے کیلئے روپیہ کثرت سے ہاتھ آیا۔ اوپر کوئی افسر نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پہلی ہی سہ ماہی کے حساب کو چیک کرتے وقت دفتر کے اکونٹنٹ نے شراب خور زاہد پر دس ہزار کی رقم اس کے حساب میں بتائی، تو اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔

ساجدہ اپنے مرحوم باپ کو اور اس کی نیکیوں کو زاہد کی موجودہ حالت سے توازن کر کے آٹھ آٹھ آنسو روتی تھی اور عیاش بھائی کے انجام پر غور کر کے ٹھنڈا سانس بھر کے خاموش ہو جاتی تھی۔

•••

حصہ دار اور ڈائرکٹر ابھی رخصت بھی نہ ہوئے تھے کہ مزدوروں کی زبردست

اور پہلی ہڑتال نے سب کے حواس باختہ کر دیئے۔ انہوں نے ایک بند کمرے میں جمع ہو کر اس آفت ناگہانی کا علاج سوچا۔ مگر کوئی چارہ کار سمجھ میں نہ آیا۔

اسٹرائک کو ایک ہفتہ کامیابی کے ساتھ گذر گیا۔ مزدوروں نے پورے عزم و استقلال کے ساتھ ہڑتال کو جاری رکھا۔ اور اپنے مطالبات میں ذرہ برابر کمی کے لئے راضی نہ ہوئے مغرور سرمایہ داروں نے مفلوک الحال اور غریب مزدوروں کو ڈرایا بھی اور مالی ترغیبات بھی دیں۔ مگر نوجوان یوسف روزانہ جلسے کر کے انہیں طلب حقوق کی تازہ روح پھونک رہا تھا۔ اس لئے سوائے چند بزدل اور لالچی مزدوروں کے جن کی تعداد پچاس سے متجاوز نہ تھی۔ تمام مزدور اپنے عہد قائم رہے۔

آخر دو ہفتہ کے صبر آزما انتظار کے بعد حصہ داروں کے جلسے میں یہ طے ہوا۔ کہ مزدوروں کے مطالبات میں سے اضافہ اُجرت دس فیصدی تسلیم کیا جائے۔ اور ایک نمائندہ ڈائرکٹروں کی جماعت میں مزدوروں کا منتخب ہو جسکو مزدور عام جلسہ میں منتخب کریں۔

اس فیصلہ کی اطلاع یوسف کو دی گئی اور اس نے اسی وقت تمام مزدوروں کو جمع کر کے ایک پُر جوش تقریر کے ساتھ اس جنگ میں فاتحانہ نکلنے پر مزدوروں کو مبارکباد دیتے ہوئے ڈائرکٹروں کے فیصلہ کو قبول کرنے کی تلقین کی۔ سوائے چند ناعاقبت اندیش نوجوانوں کے تمام مزدوروں نے یوسف کے احکام کے آگے سر جھکایا۔

مزدوروں نے یوسف زندہ باد کے نعرے لگائے۔ اور اسی وقت یوسف کا انتخاب ڈائرکٹری کے لئے کیا گیا۔ یوسف خدائے برتر کے آگے سجدۂ شکر کے لئے جُھک گیا۔ اور اس نے کھڑے ہو کر اعلان کیا کہ میں ثابت کر دوں گا کہ تم نے اپنے حقوق میرے سپرد کرنے میں غلطی نہیں کی۔ میری زندگی کا ہر لمحہ تمہاری فلاح و بہبود کے لئے وقف ہے اب میری زندگی۔ اور موت عزت و ذلت سب میرے بھائیو تمہارے مفاد سے وابستہ ہوگی تم جو حکم مجکو دوگے اس کی تعمیل میرا فرض ہوگا۔ اس کے بعد یوسف نے سب کو کام پر

جانے کی ہدایت کی۔ اور یہ خبر آج کے تمام روزانہ انگریزی، اردو، گجراتی، ہندی اخبارات میں شائع ہوئی، تمام قومی اخبارات نے یوسف کی سرگرمیوں کی تعریف کی۔ اور اس کی تصویریں شایع کیں۔

زاہد کی عیاشیوں کی بدولت نہ صرف کارخانہ کا روپیہ اس کے ذمہ واجب الادا تھا بلکہ مولانا عابد حسن مرحوم کی جمع کی ہوئی دولت جسمیں معصوم ساجدہ بھی شریک تھی۔ تباہ اور برباد ہو چکی تھی۔ مگر مخمور زاہد کی آنکھیں ابھی تک اسی طرح بند تھیں۔

ساجدہ ایک روز احمد آباد کے پبلک گارڈن میں پیازی ساڑھی باندھے ہوئے شباب میں مست بنچ پر بیٹھی ہوئی اپنے انجام پر غور کر رہی تھی کہ ناگاہ موہنی صورت والا یوسف بھی سامنے سے ٹہلتا ہوا آ گیا۔ آنکھیں چار ہوئیں دونوں نے ایک دوسرے کو غور سے دیکھا اور سکتہ کا سا عالم طاری ہو گیا۔ ساجدہ کی معصوم نگاہوں نے یوسف کی موہنی آنکھوں سے کچھ کہا، اور یوسف نے مسکرا کر جواب دیا۔ ساجدہ اور یوسف دونوں سمجھ گئے کہ اب وہ کس اسٹیج پر ہیں۔ یوسف اچھی طرح جانتا تھا کہ ساجدہ کون ہے اور ساجدہ یوسف اور اسکی سرفروشانہ جدوجہد سے بخوبی واقف تھی۔ ساجدہ نے نیم باز نگاہوں سے یوسف کا خیر مقدم کیا، اور تھوڑی دیر یوسف کھڑا ساجدہ کو دیکھتا رہا۔ اور اس کے بعد کلیجہ پر ہاتھ رکھکر ایک آہ سرد کھینچی اور روانہ ہو گیا۔

یوسف مقامی سکونت رکھنے کی وجہ سے کارخانہ کی زیادہ نگرانی کرتا تھا۔ بمقابلہ دیگر ڈائرکٹران کے اس لئے وہ ہفتہ میں ایک مرتبہ ضرور کارخانہ کے دفتر میں آتا اور حساب پر ایک نظر ڈال کر زاہد سے سرسری سوال کر کے چلا جاتا۔

زاہد کی عیاشیوں اور بد چلنیوں کی شہرت ہو چکی تھی اس لئے یوسف نے ایک روز

زاہد کی عدم موجودگی میں حساب چیک کرنا شروع کیا تو سو دو سو نہیں ہزار دو ہزار نہیں۔ اکٹھی دس ہزار کی رقم زاہد کے نام واجب تھی۔

یوسف نے فوراً اکونٹنٹ کا بیان قلمبند کر کے اکونٹ بک پر قبضہ کیا۔ اور زاہد کو طلب کیا۔ زاہد اس وقت نہ دفتر میں تھا نہ مکان پر۔ بلکہ وہ شہر کی ایک مشہور طوائف کے مکان پر شراب کے نشہ میں مخمور پڑا ہوا تھا جس وقت اس کے دوست اور شریک معصیت مجید عالم نے یوسف کی گرفت کی خبر شرابی زاہد کے کان میں پہنچائی تو اس کا نشہ ہرن ہو گیا اور ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ وہ ہکا بکا ہو کر مجید عالم کو دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اور اس پر ایک سکتہ کا عالم طاری ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد زاہد اپنے بنگلہ پر آیا۔ یہاں اس سے پہلے یوسف وٹینگ روم میں انتظار کر رہا تھا۔ زاہد کے آتے ہی یوسف نے سب سے پہلا سوال روپے کے متعلق کیا۔ زاہد کوئی معقول وجہ بیان نہ کر سکا۔ اور یوسف نے اس کو دھمکی دی کہ اگر روپیہ کا انتظام نہ ہو سکا تو علی الفور معاً پولس کے سپرد کیا جائے گا۔ زاہد بہت پریشان ہوا اور وہ اسی وقت زنانہ مکان میں جا کر آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد یہ کہتا ہوا اٹھا کہ پروا نہیں۔ ساجدہ اگر میری مدد کرے تو تمام مشکلوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔

معصوم ساجدہ کو بلا کر سارا ماجرا بیان کیا اور ہاتھ جوڑ کر کہا تو اگر چاہے تو آج اپنے بدنصیب بھائی کی زندگی بچا سکتی ہے۔ ورنہ تیرے انکار کی صورت میں یہ (تیزاب کا گلاس) میری زندگی کا خاتمہ کرے گا۔ ساجدہ زہر کا نام سُنکر لرز گئی۔ اور اس نے کانپکر کہا خدا ایسا وقت نہ لائے۔ چالاک اور بدمعاش زاہد نے دیکھا کہ تیر نشانہ پر لگا۔ اس نے پھر مصنوعی آنسو گرا کر کہا کہ ساجدہ اگر بھائی کی جان عزیز ہے تو تھوڑی سی شرم و حیا کی قربانی کر۔ ورنہ یاد رکھ کہ میں چند لمحوں کا مہمان ہوں یہ کہکر عیار عارف نے تیزاب کا گلاس ہاتھ میں لیا۔ ساجدہ دوڑی اور زاہد کا ہاتھ پکڑ کر کہا کہ "جو کہوگے کرونگی" اور یہ کہکر

تیزاب کا گلاس چھینا اور زمین پر پھینک دیا اس کے بعد دونوں میں کچھ چپکے چپکے باتیں ہوئیں۔

یوسف بیرونی کمرہ میں بیٹھا ہوا تھا کہ ساجدہ نہایت خاموشی کے ساتھ آکر اس کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ یوسف ساجدہ کو دیکھکر بے اختیار کھڑا ہوگیا اور مصافحہ کر کے سامنے کے کوچ پر ساجدہ کے سامنے بیٹھ گیا۔ ساجدہ نے اپنے ہاتھ میں یوسف کا ہاتھ لے کر دبایا۔ اور یوسف کے بدن میں ایک بجلی سی کوند گئی اور باوجود ایک اعلیٰ درجہ کے کیرکٹر کا مالک ہونے کے تنہائی اور ساجدہ کی جسارت نے اسکو ہم آغوش ہونے کی جرات دلائی وہ ابھی طرح گلے ملنے بھی نہ پایا تھا کہ زاہد مسکراتا ہوا فوٹو کا کیمرہ لئے ہوئے ان دونوں کے درمیان اپنے دوست مجید عالم کے ساتھ آکر کھڑا ہوا۔ یوسف زاہد کو اس حالت میں دیکھتے ہی سہم گیا۔ اور ساجدہ نے منہ پھیر کر حقارت کی ہنسی سے زاہد کو سلام کیا یوسف نہایت شرمساری کے ساتھ بغیر اجازت لئے رخصت ہوگیا اور عارف نے ساجدہ کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اب یوسف میرے قبضہ میں ہے اور میرے خلاف حرکت کرنے کی اسکو جرائت نہیں ہوسکتی۔ اور یہ تمہاری عنایت کا نتیجہ ہے۔ ساجدہ پر ایک استغراقی حالت طاری تھی۔ اور وہ اس حالت میں خاموش زنانہ مکان میں چلی گئی۔

دوسرے روز یوسف اپنے کمرہ پر بیٹھا ہوا کل کے واقعہ پر اور اس کے نتایج پر غور کر رہا تھا کہ ایک نو وارد نے لفافہ لا کر دیا۔ یوسف نے گھبرا کر لفافہ چاک کیا تو اس میں کل کے واقعہ کا فوٹو نکلا اور اس کے ساتھ حسب ذیل تحریر تھی۔

جناب من : تسلیم !

اگر آپ میرے معاملہ میں خاموشی اختیار کریں گے تو یہ فوٹو گم اور اس کی پلیٹ خراب کی جاسکتی ہے۔ ورنہ تمام مزدوروں، تمام اخباروں میں، تمام حصہ داروں میں آپکی

اس تصویر کی اشاعت ہوگی۔ اور میری بہن اپنی توہین کا دعویٰ عدالت میں دائر کریگی۔ خاموشی کی حالت میں ساجدہ آپ کی ہے۔

آپ کا مخلص۔ زاہد

اس خط کو پڑھتے ہی یوسف کے حواس گم ہوگئے اس کے سامنے "احساس فرض اور محبت" دو چیزیں تھیں جنہیں سے وہ ایک کو اختیار کرسکتا تھا۔ ادائیگی فرض کے ساتھ ایک زبردست سازش کے ماتحت بڑی ذلت و رسوائی تھی۔ اور خاموشی کی صورت میں ساجدہ کے ملنے اور بامراد ہونے کا موقع حاصل تھا۔ ایک طرف ہزارہا حصہ داروں کا روپیہ تھا جنمیں یتیم، بیوائیں اور صدہا مفلوک الحال انسان تھے۔ دوسری جانب وعل محبوب کی ذاتی غرض، یوسف عجیب کشمکش میں تھا، کہ بالآخر اس کو اپنی وہ تقریر یاد آئی جو اس نے ڈائرکٹری کے انتخاب کے وقت کارخانہ کے ہزارہا مزدوروں کے سامنے کی تھی۔ اس تقریر کے یاد آتے ہی اسمیں ایک تازہ روح دوڑگئی اور وہ ادائیگی فرض کے مقابلہ میں ہر قسم کی ذلت و رسوائی تباہی و بربادی کے لئے تیار ہوگیا اور اس نے یہ فیصلہ کیا کہ خواہ نتیجہ کچھ ہی کیوں نہ ہو مجکو فوراً حصہ داروں اور مزدوروں کو اس زبردست بددیانتی سے آگاہ کرنا چاہیئے۔ میں مزدوروں کے حقوق کا محافظ ہوں میں یتیموں اور بیواؤں کے روپیہ کا امین ہوں۔ مجھے ہر طرف سے آنکھیں بند کرکے اپنے فرض کو انجام دینا چاہیئے۔ اس کے بعد یوسف نے ایک اعلان حصہ داروں اور ڈائرکٹروں کے نام شائع کیا جسمیں ایک اہم اور فوری ضرورت کے لئے جلسہ طلب کیا گیا۔

تمام حصہ دار یوسف کو اچھی نظر سے دیکھتے تھے۔ اس لئے ایک ہفتہ کے بعد حصہ داروں اور ڈائرکٹروں کا ایک بڑا اجتماع وکٹوریہ مل کی عمارت میں ہوگیا جو اس سے پہلے کبھی نہ ہوا تھا

ساجدہ زنانہ مکان کے ڈرائنگ روم میں بیٹھی بال بنارہی تھی کہ اس کو خیال آیا

کہ میرا سیاہ کار بھائی کل اپنی بد اعمالیوں کو چھپانے کے لئے میرے بچھائے ہوئے جال میں یوسف کو پھانسے گا۔ اس خیال کے آتے ہی اس پر ایک غنودگی سی طاری ہوئی۔ کیا دیکھتی ہے کہ مولوی عابد حسن مرحوم کی پاک روح کھڑی ہے اور ساجدہ کو اس کمینہ حرکت پر لعنت ملامت کر رہی ہے وہ اپنے باپ کی رُوح کے آگے ہاتھ جوڑے کھڑی تھی کہ بدمعاش زاہد نے شانہ پکڑ کر ہلایا اور کہا کہ "کل حصہ داروں کے جلسہ میں تمہارا بیان ہے جس کی تائید میں یہ فوٹو اور اس کی پلیٹ پیش کرنی ہوگی اور بس اس بیان پر یوسف کا نام ڈائرکٹری سے خارج کر دیا جائے گا۔ میں نے سب انتظام کر دیا ہے" ساجدہ نے کہا بہتر ہے۔ یہ فوٹو اور پلیٹ یہیں چھوڑ جایئے۔ عیار زاہد معصوم ساجدہ کو تمام فوٹو جو کارڈ سائز پر پانسو تیار تھے اور فوٹو کی پلیٹ ساجدہ کو دیکر چلا گیا۔

فرشتہ خصلت ساجدہ نے شیطان سیرت زاہد کے جانے کے بعد تمام فوٹو اور پلیٹ کو ایک صندوقچہ میں بند کر کے مہر لگائی۔ اور رات کے دس بجے اپنی محرم راز خادمہ کے ہاتھ یوسف کے پاس ایک لفافہ کے ساتھ بھیجدیا۔

بے خبر یوسف!

تم کو معلوم نہیں کہ تمہارا شکار کرنے کے لئے کیا کیا سامان کئے گئے ہیں بہرحال تم کو خوش ہونا چاہیئے کہ وہ سازش ختم ہوگئی۔ اور اب مطمئن ہو جاؤ کہ تمہارے خلاف کل کے جلسہ میں کچھ نہ ہو سکے گا۔ تم ایمانداری کے ساتھ اپنا فرض انجام دو۔ وہ فوٹو جو کل کے جلسہ میں تقسیم کرنے کے لئے تیار کئے گئے تھے سب تمہارے پاس مع پلیٹ کے صرف تمہارے اطمینان کے لئے بھیج رہی ہوں۔

تمہاری ساجدہ

یوسف اس تحریر کو اور فوٹو دیکھکر حیرت میں تھا، وہ کبھی اس پر غور کرتا تھا کہ اگر کل کے جلسہ میں یہ فوٹو تقسیم ہو جاتا تو میری عزت کی خیر نہ تھی۔ اس کے ساتھ ہی اسکے

دل میں ساجدہ کے لئے ایک انس پیدا ہو گیا۔ وہ ساجدہ کی اس مخلصانہ حرکت پر گھنٹوں غور کرتا رہا۔ اور اسی حالت میں اسے نیند آگئی۔

(۴)

وکٹوریہ ملز کے احاطہ میں مغربی جانب ایک وسیع کمرہ میں تین سو سے زائد حصہ دار اور ڈائریکٹر جمع ہیں ٹھیک دس بجے مسٹر سہراب جی کی صدارت میں جلسہ شروع ہوا سہراب جی نے آج کے جلسہ کی اہمیت ایک مختصر سی تقریر میں حاضرین کے ذہن نشین کی اور اس کے بعد یوسف نے کہا۔

برادران!

آج آپ حضرات کو اس لئے تکلیف دی گئی ہے کہ آپ نے جس شخص کو امین مقرر کیا ہے اس کی دیانت کا راز طشت از بام کیا جائے۔ پھر آپ نے بھروسہ اور اعتماد کر کے میرے ذمہ کچھ فرائض عائد کئے تھے میں اپنے فرائض کی بجا آوری کے لئے دفتر میں آیا تو یہ اندھیر دیکھا کہ ایک نہ دو دو نہ چار اکٹھے دس ہزار روپے کی خیانت جو یقیناً قابل برداشت ہے۔ یہ کارخانہ مشترکہ ہے جس میں غریب امیر، مزدور، سرمایہ دار، بیوائیں اور یتیم غرضکہ ہر قسم کے لوگ حصہ دار ہیں۔ اور ان کے روپے کی حفاظت تمام ڈائریکٹروں کا اولین فرض ہے جسکی ادائگی پر اس کارخانہ کی موت اور زندگی کا دارومدار ہے:

خوب یاد رکھو کہ اگر آج ہم نے اس خیانت پر چشم پوشی کی تو کل ہم کو اس عظیم الشان کارخانہ اور اس کی تمام مشینوں سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ اور اگر آج ہم نے مضبوط ارادہ کے ساتھ اس بدمعاشی اور خیانت کا قلع قمع کر دیا۔ تو کارخانہ کی عمر ایک صدی گنے لئے بڑھ گئی خیانت ایک گھن ہے۔ جو لکڑی کے ستون میں لگنے کے بعد تمام عمارت کو خطرے میں ڈال دیتا ہے بس جس طرح گھن لگنے کے بعد تمام مکان خطرہ میں ہوتا ہے۔ اسی طرح خیانت کے بعد کارخانہ خطرے میں ہے اس لئے میں آپ حضرات کے سامنے اکونٹنٹ کا بیان۔ اور رجسٹر جن پر

میں نے قبضہ کر لیا تھا پیش کر کے استدعا کرتا ہوں کہ بددیانت اور خائن زاہد کو جلد سے جلد
اس کی موجودہ خدمات سے سبکدوش کر کے کسی دوسرے مینجنگ ڈائرکٹر کو مقرر کیا جائے
اور جتنی جلدی ہو سکے زاہد سے چارج لے لیا جائے۔ اگر زاہد کے باپ کی مخلصانہ خدمات
سامنے نہ ہوتیں تو میں اس ہاؤس سے اپیل کرتا کہ اس بدمعاش کو پولس کے حوالہ کیا جائے
مگر مرحوم مولانا عابد حسن کی گذشتہ خدمات کے نام پر اپیل کر کے آپ سے التجا کروں گا کہ
اس شرابی کو اس کے حال پر چھوڑا جائے۔ اور اس کو سردست معاف کر دیا جائے۔
پس یہی آج کے جلسہ کی غرض و غایت ہے جس کے لئے آپ سب حضرات کو تکلیف دی گئی۔

اس تقریر کو سنکر نگاہیں زاہد کی طرف اُٹھیں۔ زاہد نے مڑ کر جلدی جلدی ساجدہ کو دیکھنا شروع کیا۔ مگر کمان سے تیر نکل چکا تھا۔ ساجدہ نہ خود آئی۔ اور نہ کوئی بیان دیا۔ زاہد کو ہرگز اپنی ماں جائی سے یہ توقع نہ تھی۔ زاہد غصہ میں دانت پیسکر خاموش ہو رہا۔ اس کے پاس یوسف کی تقریر کا کوئی جواب نہ تھا۔ البتہ حصہ داروں میں اس کے چند حامی تھے۔ جن کو اس سے ہمدردی تھی۔ مگر زاہد سے زیادہ انکو اپنے روپے سے ہمدردی تھی۔ اور جب معاملہ بالکل صاف ہو تو کوئی کیا خاک حمایت لیتا اکثر ڈائرکٹر یہ چاہتے تھے کہ عیاش زاہد سے روپیہ وصول کیا جائے۔ یا اس کو پولس کے حوالہ کیا جائے۔ مگر یوسف کے اس اپیل کو سب نے منظور کیا اور متفقہ طور پر یہ فیصلہ ہوا کہ زاہد کے قبضہ سے تمام کاغذات وغیرہ لیکر سردست یوسف کو انچارج مقرر کیا جائے۔ اور اس شرابی کو بیک بینی و دو گوش فوراً کارخانہ سے نکالدیا جائے۔ ہرچند یوسف جدید عہدہ کو قبول کرنے میں متامل تھا۔ مگر جلسہ کے انکار کے آگے اس کا اصرار قبول نہ ہوا۔

یوسف کو کارخانہ کا چارج لئے ہوئے ایک ہفتہ بھی نہ گذرا تھا کہ اسکی شادی ساجدہ کے ساتھ نہایت خاموشی کے ساتھ عمل میں آئی اور لوگوں نے حیرت کے ساتھ دیکھا کہ منحوس اور عیاش زاہد اس شادی میں شریک نہ ہوا۔

ایثار کا پھل

ثریا کو اسپتال میں پڑے ہوئے آج پورے تیرہ دن ہو چکے تھے۔ اس عرصہ میں اسے شدید سے شدید بخار بھی چڑھا، کلیجہ کے درد سے بھی متواتر کئی روز تک تڑپی، اور پھر جگر کے پھوڑے کا آپریشن بھی ہو گیا مگر اس کی سسرال والوں میں سے کسی نے جھوٹے منہ بھی کبھی آکر یہ نہ پوچھا کہ تیرا کیا حال ہے۔ ساس نندوں سے تو اسے اسی قسم کی توقع تھی لیکن خاوند کے متعلق ابھی تک یہ حسن ظن باقی تھا کہ وہ لاکھ ناراض سہی مگر اس حالت میں کہ میری زندگی کی بھی آس باقی نہیں ہے وہ ضرور آئیں گے۔ آپریشن کے لئے جب اسے میز پر لٹایا گیا تو اس نے چپکے سے اپنے بھائی کے کان میں کہا تھا کہ اگر اس وقت کسی طرح "وہ" آجاتے تو میں ان سے اپنے قصور معاف کرا لیتی خدا جانے اس آپریشن کے بعد میں بچوں بھی یا نہ بچوں۔ آپریشن کے بعد جب کلوروفارم کا اثر دور ہوا اور وہ ہوش میں آئی تب بھی اس نے سب سے پہلے اپنی ماں سے یہی پوچھا تھا کہ "وہ" آئے تھے؟

دبیر کو اپنی بیوی کی بیماری کی خبر تھی اور یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ بیماری بہت خطرناک ہے۔ آپریشن والے دن اسے یہ خبر بھی لگ گئی تھی کہ آج اس جگر کے پھوڑے میں شگاف دیا جائے گا اور ثریا کی انتہائی کمزوری کی وجہ سے ڈاکٹر کو یہ بھی اندیشہ ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپریشن کے صدمے کو وہ برداشت نہ کر سکے، مگر یہ سب کچھ معلوم ہونے کے باوجود اس نے اتنا بھی نہ کیا کہ ملاسے خود نہ آیا تھا تو کسی کو بھیج کر ہی خیریت دریافت کرا لیتا۔

دبیر اور ثریا کی شادی کو ابھی صرف چار ہی برس گذرے ہیں لیکن مزاجوں کی ناموافقت کچھ ایسا رنگ لائی کہ پورا ایک سال بھی خوشی اور خرمی میں نہ گذرا۔ چھوٹے

موٹے اختلافات تو چھٹے یا ساتویں ہی مہینے سے شروع ہو گئے تھے لیکن باقاعدہ جنگ گیارہویں مہینے میں ہوئی، اور وہ نامبارک لڑائی کچھ ایسی منحوس گھڑی سے شروع ہوئی تھی کہ پھر کسی طرح اس کا سلسلہ بند نہ ہوا یہاں تک کہ کوئی دو سال تک مسلسل تعلقات کشیدہ رہنے کے بعد دبیر نے بھی یہی چاہا کہ ثریا اپنے میکے چلی جائے اور ثریا کے میکے والوں نے بھی اسے بلا لینا ہی اس کے حق میں بہتر سمجھا۔ اب کوئی سال بھر سے وہ برابر اپنی ماں کے پاس رہتی تھی اور سسرال سے اتنا سا تعلق بھی باقی نہ رہا تھا کہ کبھی چھٹے چھ ماہے تو کوئی خبر کو آ جاتا۔

ثریا کوئی نالائق یا نازمانبردار لڑکی نہ تھی اور حق یہ ہے کہ خاوند سے بگاڑ ہونے میں اس کا اگر کچھ قصور تھا تو اتنا کہ جب اس کی ساس نندیں اس پر جھوٹے الزام لگاتیں اور دبیر ناراض ہوتا تو وہ کبھی پلٹ کر جواب نہ دیتی اور اسکی خودداری یا غرور کبھی اس کو اجازت نہ دیتا کہ اصل حالات سے ایک ایسے خاوند کو اطلاع دیدے جو یکطرفہ بیان سنتے ہی اس کے خلاف فیصلہ صادر کر دیا کرتا تھا۔ ہمیشہ اس کی یہی حالت رہی کہ جب دبیر نے اس پر کوئی جھوٹا الزام اپنی ماں یا بہن سے سنکر لگایا اور ناراض ہوا تو وہ غصہ کی وجہ سے بالکل خاموش ہو گئی اور کبھی یہ نہ کیا کہ خاوند سے صاف صاف کہدیتی کہ یہ الزام غلط ہے۔ وہ چاہتی تھی کہ خاوند میں خود اتنی عقل ہو اور اس کے دل میں بیوی کی اتنی محبت ہو کہ جب ماں یا بہن سے کچھ سنے تو خفا ہونے سے پہلے بیوی سے دریافت حال کر لے، اور جب وہ دیکھتی تھی کہ اس کے خاوند کو اتنی سی بھی عقل یا اتنی ذرا سی بھی محبت نہیں ہے تو اس کا دل ٹوٹ جاتا تھا اور غم اور غصہ کی وجہ سے اس کی زبان بالکل بند ہو جاتی تھی۔ اس کی اس خاموشی کو دبیر ہمیشہ اعتراف گناہ کا ہم معنی سمجھتا تھا اس لئے بار بار بیوی سے اسی قسم کے قصور سرزد ہوتے دیکھکر اور اس کی خاموشی سے یہ نتیجہ نکال کر کہ اس کے پاس الزام کا کوئی جواب نہیں ہے

وہ برابر متنفر ہوتا چلا گیا، اور بالآخر وہ وقت آ گیا کہ جب اسے ثریا کا اپنے گھر میں رہنا کسی طرح گوارا نہ ہو سکا۔

علیحدہ ہونے کے بعد بھی کبھی اسے خیال نہ آیا کہ اگر اور کچھ نہیں تو کم سے کم بیوی کا خرچ تو اس کے گھر بھیج دیا کرے۔ اسے حقیقتاً ثریا سے دلی نفرت ہو گئی تھی اور اگر کبھی اتفاق سے گھر میں کسی کی زبان سے اس کا ذکر سن لیتا تھا تو اسے ناگوار گزرتا تھا۔ اپنی اس قدر کمزوری کے باوجود بھی ایمان کی بات یہ ہے کہ دبیر بدطینت یا ظالم نہ تھا۔ اسے اس کے گھر والوں نے یہ یقین دلا دیا تھا کہ اس کی بیوی بدترین عورت ہے اور یہ اسکی کمزوری تھی کہ اس نے کامل تحقیق و تفتیش کے بغیر ماں اور بہن کی اس رائے کو قبول کر لیا۔ اگر ثریا اتنی غیر ضروری خودداری نہ برتتی اور ہر مرتبہ الزام لگائے جانے کے موقعے پر اپنی بریت کے ثبوت دیدیا کرتی تو غالباً دبیر کو اس سے کبھی نفرت نہ ہوتی اور شاید دو چار مرتبہ کے بعد پھر وہ اپنی ماں اور بہن ہی کے متعلق یہ فیصلہ کر لیتا کہ یہ ہمیشہ یونہی جھوٹے الزام لگایا کرتی ہیں لیکن ثریا کی خاموشی نے سب کام بگاڑ دیا اور دو ایسے میاں بیوی جن میں کوئی سا ایک بھی برا نہ تھا بے وجہ بے سبب ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے۔

دبیر اول تو مرد تھا دوسرے یہ کہ اسے ثریا سے نفرت بھی ہو گئی تھی اس لئے اس پر تو اس علیحدگی کا کچھ زیادہ اثر نہ پڑا لیکن ثریا کی حالت اس سے بالکل مختلف تھی۔ اسے دبیر کی ان زیادتیوں کے باوجود اس سے محبت ہو گئی تھی اور اس دائمی علیحدگی نے اس کی جان پر بنا دی۔ تین سال تک جب تک کہ وہ خاوند کے ساتھ رہی اس نے کبھی کسی بات میں بھی دبیر کی ذرا سی نافرمانی نہ کی اور ہمیشہ اس بات کی کوشش کیا کرتی تھی کہ اپنے آپ کو مٹا کر دبیر کی خدمت کرے اور اب علیحدگی کے بعد بھی اسکی دلی تمنا تھی کہ کسی طرح آپس میں پھر صفائی اور مصالحت ہو جائے۔ تمناؤں کی پامالی

نے صدمہ کی صورت اختیار کی اور اس ہر وقت کے صدمہ نے اسکی صحت پر اثر ڈالنا شروع کیا۔ اچھی طرح بھرا ہوا اور گداز جسم گھل گھل کر کانٹا ہو گیا' اور ہر وقت ہلکی ہلکی حرارت رہنے لگی۔ غم کی بیماری سچ مچ کی بیماری بن گئی اور اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ اسپتال میں پڑی ہوئی اپنے مرنے کی دعائیں مانگ رہی تھی۔

(۴)

"تم واقعی بڑے ظالم ہو" مظہر نے دبیر سے کہا اور افسردگی کے ساتھ خاموشی اختیار کر لی۔

دبیر۔ میں نہیں سمجھتا کہ میں کیوں ظالم ہوں۔ کیا اس لئے کہ ایک نالائق اور نافرمان بیوی سے محبت نہیں کر سکتا۔

مظہر۔ اس لئے کہ تم ایک مظلوم عورت کو جس کی صرف یہ آرزو ہے کہ مرنے سے پہلے ایک مرتبہ تمہیں دیکھ لے اپنی صورت دکھانی نہیں چاہتے۔

دبیر۔ ثریا ہرگز مظلوم نہیں ہے' اور میں جانتا ہوں کہ اس کی یہ خواہش اور آرزو بھی محض ایک تفنیع اور ایک بناوٹ ہے۔ اس طرح وہ دنیا کو دکھانا چاہتی ہے کہ میں نے اسپر ظلم کئے ہیں اور اس کا کوئی قصور نہ تھا۔ میں ان فریبوں میں آنیوالا نہیں ہوں

مظہر۔ تم نے بہت جلدی میں یہ فیصلہ کیا ہے۔ میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ اسکی زندگی کی طرف سے اس کے معالج بھی تقریباً مایوس ہو چکے ہیں' اور اتنا تو تم بھی سمجھ سکتے ہو کہ بستر مرگ پر پڑے پڑے دنیا کو دھوکہ دینے کا کسی کو خیال نہیں آیا کرتا۔

دبیر۔ مظہر! تم اصلی حالات سے واقف نہیں ہو اسی لئے ایسا کہہ رہے ہو۔ بدقسمتی سے مجھے اپنی بیوی کے متعلق یہ تمام باتیں کہنی پڑ رہی ہیں' لیکن حقیقت یہی ہے کہ وہ ایک بڑی چالاک اور مکار عورت ہے۔ اسنے تین سال میں میری زندگی تلخ کر دی' اور میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ صرف اسی کی وجہ سے اب مجھے اپنی زندگی میں کوئی لطف نہیں آتا

میں نے اسے خوش رکھنے کی انتہائی کوششیں کیں، اور ہمیشہ اپنی حیثیت سے زیادہ اس کے لئے خرچ کیا صرف اسی ایک امید میں کہ شاید وہ مجھ سے مانوس ہو جائے اور محبت کرنے لگے، لیکن سب امیدیں بیکار ثابت ہوئیں اور اس نے کبھی مجھے اپنا خاوند اور میرے گھر کو اپنا گھر نہ سمجھا۔

منظہر۔ اگرچہ یہ ظاہر ہے کہ میں ثریا کے حالات سے کسی طرح بھی اتنا باخبر نہیں ہو سکتا کہ جس قدر تم ہو لیکن مجھ سے خود ڈاکٹر نے یہ کہا ہے کہ اسے خاوند سے علیحدہ ہونے کا اس قدر صدمہ ہوا ہے کہ اسکی صحت بالکل خراب ہو گئی، اور میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ اگر صرف ثریا کے بھائی نے مجھ سے کہا ہوتا تو شاید میں تم سے اس قدر ضد اور اصرار کے ساتھ درخواست نہ کرتا لیکن خود ڈاکٹر نے مجھ سے یہ کہا ہے کہ اگر اس کا خاوند آجائے تو اس کے مرض پر بہت ہی اچھا اثر پڑے گا اور ممکن ہے کہ اسکی جان بچ جائے۔

دبیر (کچھ سوچکر) بھئی منظہر تم مجھے معاف کرنا کہ میں تمہارے کہنے کو ٹال رہا ہوں مگر میں کیا کروں کہ میرا دل کسی طرح بھی گوارا نہیں کرتا کہ اسکی صورت دیکھوں یا اس بلا کو پھر اپنے سر لگالوں۔

(۱۰)

دبیر ہندوستان کے بہترین پولو کھیلنے والوں میں سے تھا اور یہی وجہ تھی کہ اس سال بھوپال کی پولو ٹیم نے اس سے درخواست کی تھی کہ ٹورنامنٹ میں ان کی طرف سے کھیلے۔ دبیر نے خوشی سے اسے منظور کر لیا اور چونکہ ٹورنامنٹ میں صرف پندرہ روز باقی تھے اس لئے وہ فوراً دہلی سے بھوپال روانہ ہو گیا تاکہ اتنے عرصہ میں کچھ مشق بھی کرلے اور کچھ نئے ساتھیوں کے ہمراہ کھیلنے کی عادت ڈال لے۔ آنکھ بند کرتے پندرہ دن گذر گئے اور دہلی میں مختلف مقامات سے پولو کی ٹیموں کی آمد شروع ہو گئی۔ بھوپال کی ٹیم ابتدائی

دو ایک میچ جیت لینے کے بعد آخری کھیل میں آگئی اور اب اس کا مقابلہ انگریزوں کی ایک بڑی مشہور ٹیم سے تھا جو اسی کی طرح شروع کے مقابلوں میں کامیاب ہوتی چلی آرہی تھی۔ ہلکے آسمانی رنگ کی وردیاں پہنے ہوئے صبا رفتار گھوڑوں پر سوار بھوپال کی ٹیم نکل کر میدان میں آئی اور کھیل شروع ہو گیا۔ دونوں ٹیمیں کچھ اس قدر برابر کی کھیلنے والی تھیں کہ نصف وقت گذر گیا اور طرفین کی انتہائی کوشش کے باوجود کوئی ایک گول بھی نہ کر سکا۔ دوسرے نصف گھنٹے میں مقابلہ اور بھی سختی کے ساتھ ہوا۔ گھوڑے بھی اپنے مالکوں کی تشویش میں برابر کا حصہ لے رہے تھے اور گیندوں کے پیچھے کچھ اس طرح جاتے تھے کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہ خود کھیل رہے ہیں۔ دس دس منٹ میں دو چکر ختم ہو چکے لیکن کسی فریق کو کسی قسم کی کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ آخری دس منٹ میں کھیل کا جوش اس قدر بڑھ گیا اور فریقین نے ایسی جان توڑ کوشش شروع کی کہ تماشائیوں کو خوف معلوم ہونے لگا۔ سواروں کا اندھا دھند گھوڑے دوڑانا اور نتائج سے بے پروا ہو کر پوری طاقت سے ایک دوسرے کو دھکیلنا ایسی چیزیں تھیں کہ جنہیں دیکھکر اکثر تماشائی ڈرے جا رہے تھے اور بار بار انہیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب کوئی گرا اور اب کسی کی جان گئی۔ کھیل ختم ہونے میں صرف دو منٹ باقی تھے کہ ایک مرتبہ گیند دبیر کے ہاتھ آگئی۔ گھوڑا بھی اس کے پاس بہت تیز تھا، وہ گیند کو لیکر چلا اور تماشائیوں نے شاباش شاباش کے فلک شگاف نعروں سے اسکی ہمت بڑھائی۔ پوری تیزی سے وہ گیند لئے ہوئے فریق مخالف کے گول کے سامنے پہونچ گیا اور ایک جچا ہوا اور بھرپور ہاتھ ایسا لگایا کہ گیند گول کے پار تھی لیکن عین اسی وقت کہ جب اس نے یہ ہاتھ لگایا اس کے گھوڑے نے کچھ اس بری طرح سے ٹھوکر کھائی کہ گھوڑا اور سوار دونوں لوٹ پوٹ ہو گئے۔ ہر شخص بے تاب و بے قرار ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا مگر جب وہ بالکل نہ ہلا تو لوگ بھاگے ہوئے اس کے پاس پہنچے اور معلوم ہوا کہ وہ بالکل بے ہوش ہے۔ نہایت احتیاط کے

ساتھ اور جلد سے جلد اسے اسپتال پہونچایا گیا جہاں ڈاکٹر نے یہ رائے دی کہ اس کے سر کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے اور اسکی جان سخت خطرہ میں ہے۔

(۳)

ہیلو ثریا بیگم صاحبہ آج آپ اٹھکر کیسے بیٹھ گئیں۔ ہم نے تو ابھی آپ کو اٹھنے کی اجازت نہیں دی ہے۔

ثریا۔ (بڑی لجاجت کے ساتھ) ڈاکٹر صاحب میرا خاوند زخمی ہوکر آپ کے اسپتال میں آیا ہے اور میں آپ سے بڑی عاجزی سے یہ درخواست کرتی ہوں کہ آپ مجھے اسکے پاس جانے اور اس کی خدمت کرنے کی اجازت دیں۔

ڈاکٹر۔ کیا مسٹر دبیر آپ کے خاوند ہیں؟

ثریا۔ (شرماکر) جی ہاں

ڈاکٹر۔ ان کے سر کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے اور دماغ کو صدمہ پہونچا ہے ان کے پاس جانے کی اجازت ہم نے ان کے کسی دوست یا رشتہ دار کو نہیں دی کیونکہ ذرا سا شوروغل یا ذرا سی بے احتیاطی ان کے لئے مہلک ہو سکتی ہے۔ آپ بھی ان سے اسی وقت ملنے گا کہ جب وہ اچھی طرح ہوش میں آجائیں۔

ثریا۔ میں تو ان کی خدمت کرنی چاہتی ہوں۔

ڈاکٹر۔ مگر آپ میں اتنی طاقت کہاں ہے۔

ثریا۔ میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ مجھ میں اس کام کے لئے بہت طاقت ہے اور اگر اس کام میں میں مر بھی جاؤں تو اس سے بڑھکر میرے لئے اور کیا خوش نصیبی ہو سکتی ہے۔

ڈاکٹر نے عزت و تعظیم کے ساتھ ثریا پر نگاہ ڈالی اور یہ کہکر چلا گیا کہ میں ان کی حالت دیکھکر آپ کو جواب دوں گا۔

٭٭٭

مسلسل سات روز تک بے ہوش رہنے اور بخار میں جلنے کے بعد آٹھویں دن خدا خدا کرکے دبیر کے دماغ پر صدمے کا اثر کسی قدر کم ہونا شروع ہوا اور شام کے قریب اسکی پلکوں اور لبوں کو خفیف سی جنبش ہوئی۔ اس کے سرہانے جو نرس بیٹھی ہوئی تھی اس نے زندگی کی یہ علامات دیکھکر فوراً ڈاکٹر کو مطلع کیا۔ ڈاکٹر آیا، مریض کی حالت دیکھی اور نرس کو ضروری ہدایات دیکر چلا گیا۔ رات کو نو بجے کے قریب دبیر نے آنکھیں کھولیں اور تھوڑی دیر تک دیوانوں کی طرح چھت کو دیکھتا رہا۔ آہستہ آہستہ اسے پولو میں اپنا گرنا یاد آیا اور یہ سمجھکر کہ میں ابھی ابھی گرا تھا اس نے اٹھنا چاہا۔ نرس نے اٹھکر آہستگی سے اٹھنے سے روکا اور کہا کہ آپ کے بہت سخت چوٹ لگی تھی اب آپ اسپتال میں ہیں اور حالت رو بہ صحت ہے۔ ڈاکٹر کا حکم ہے کہ آپ بالکل حرکت نہ کریں۔

دبیر۔ تو میں کے گھنٹے بے ہوش رہا۔

نرس۔ آپ آج آٹھویں دن ہوش میں آئے ہیں۔ اب آپ یہ عرق پی کر سو جائیے صبح کو آپ کی طبیعت بہت اچھی ہوگی اس وقت سب کچھ پوچھ لیجئے گا۔

دبیر۔ آپ کون ہیں۔

نرس۔ میں اس اسپتال کی ایک نرس ہوں۔

دبیر نے عرق پیا اور خاموش ہو کر پڑ گیا۔

دوسرے دن صبح کو جب دبیر کی آنکھ کھلی تو پھر اس نے اسی نرس کو اپنے سرہانے بیٹھا پایا اور اپنے مرض کے متعلق سوالات کی بھرمار کردی۔ بار بار وہ نرس کی صورت غور سے دیکھتا تھا اور اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھکر اپنے حافظہ پر زور دیتا تھا کہ گویا کچھ یاد کر رہا ہے۔ ابھی دس بیس ہی سوالوں تک نوبت پہونچی تھی کہ ڈاکٹر منظر کو اپنے ساتھ لئے ہوئے کمرے میں داخل ہوا

ڈاکٹر۔ کہئے مسٹر دبیر اب کیسا مزاج ہے۔

دبیر۔ مجھے تو ابھی یہی نہیں معلوم ہے کہ میں کیا بیمار تھا اور کب سے بیمار تھا۔

ڈاکٹر۔ نرس نے آپ کو بتا تو دیا ہوگا۔

دبیر۔ یہ تو کہتی ہیں کہ میں آٹھ دن بے ہوش رہا۔

ڈاکٹر۔ بالکل ٹھیک کہتی ہیں۔ آپ کے سر کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ مجھے تو بالکل امید نہ تھی کہ آپ بچ جائیں گے۔

دبیر آپ نے میرے لئے بڑی تکلیف اٹھائی۔ میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

ڈاکٹر۔ میری بجائے آپ کو اپنی اس مہربان نرس کا شکریہ ادا کرنا چاہیے جس نے آپ کے لئے رات کو رات اور دن کو دن نہ سمجھا اور برابر آٹھ راتیں جاگ کر آپ کی تیمارداری کی۔

دبیر نے نرس کا شکریہ ادا کرنے کے لئے سرہانے کی جانب نگاہ پھیری اور اسی کے ساتھ اور سب نے بھی اس طرف دیکھا تو معلوم ہوا کہ نرس وہاں سے غائب تھی۔

٭

دبیر۔ ثریا خدا کے لئے میرا قصور معاف کر دو۔ میں نے تمہاری کچھ قدر نہ کی مجھے ڈاکٹر صاحب سے تمام حالات معلوم ہو گئے ہیں۔ مجھے یہ یقین دلایا گیا تھا کہ تم میری دشمن ہو اسی لئے مجھے تم سے نفرت ہو گئی تھی۔ میں کیا جانتا تھا کہ تم مجھ سے اس قدر محبت کرتی ہو کہ خود اس قدر شدید مرض میں مبتلا ہونے کے باوجود تم نے آٹھ راتیں میرے سرہانے بیٹھ کر کاٹیں۔ افسوس میں کس قدر بے وقوف تھا خدا کے لئے ثریا تم مجھے معاف کر دو۔

ثریا۔ ایسی باتیں کر کے تم مجھے کیوں گنہگار کر رہے ہو تم میرے مالک ہو اور اگر کسی غلطی کی وجہ سے تم نے اتنے دنوں تک مجھ سے بے پروائی برتی تو اسمیں خطا اور قصور کی کونسی بات ہے۔ اصل میں خطا تو میری ہے کہ میں نے کیوں تمہیں

اصل حالات سے بے خبر رکھا۔ مجھے اگر کچھہ تکلیف پہونچی ہے تو اس میں سراسر میرا اپنا قصور ہے تم پر اس کا کوئی الزام نہیں ہے

دبیر (محبت آمیز نگاہیں ڈال کر) تم واقعی حد سے زیادہ نیک اور شریف ہو



قابلِ شوہر ووی ہے

جو عورت کی فطرت کو اچھی طرح سمجھ لے اور محبوبہ سے لطف اندوز ہونے کا صحیح طریقہ جانتا ہو ازدواجی زندگی کی نازک ذمہ داریوں کو سمجھتا ہو۔

شبِ عروسی

قیمت عہ/

پڑھ لینے کے بعد تمہیں یہ سب باتیں معلوم ہو جائیں گی اور تم کو خانگی زندگی میں جنت کا لطف آئیگا۔ نوجوانوں کے لئے

علم الازدواج پر یہ معرکۃ الآرا کتاب عرصہ دراز کی محنت اور ہندی اور انگریزی کتابوں کی ورق گردانی کے بعد بصرف کثیر حال ہی میں تیار ہوئی ہے۔ یہ مغرب (یورپ) کی تمام تازہ ترین صنفی تحقیقاتوں کا جوہر ہے یہ ہندوستان کے صاحب فن اور علم ازدواج کے ماہرین کی تمام تصانیف کا لب لباب ہے۔ اس میں ازدواجی زندگی کی اہم ذمہ واریوں کا تذکرہ ہے بیوی سے صحیح معنوں میں محبوبہ بنا کر لطف اندوز ہونے کے طریقے ہیں اور اسمیں عورت کی فطرت پہچاننے اور اسپر ہر طرح قابو پانے کے طریقے ہیں اس کے پڑھنے سے تمام عمر میاں بیوی میں اختلاف ہونے کا امکان نہیں کتاب کا اندازہ فہرست مضامین سے کیجیے مصنف کا دعویٰ ہے کہ صنفی تعلقات اور ازدواجی پر اردو زبان میں آجتک کوئی کتاب لکھی گئی نہ لکھنے کی اُمید ہے شروع کتاب میں ایک نہایت دلکش اور کیف پرور عورت کے صحیح جذبات سے پُر۔ رعنائی کے مجسمے کی رنگین تصویر بھی ہے۔ تین سو مضامین ہیں ۲۰۰ صفحے ضخامت۔ کاغذ بہت دبیز چکنا قیمت معہ تصویر ایک روپیہ (عہ/)

فہرست مضامین کتاب شب عروسی

دوسرا باب (۲)

تیسرا باب

چوتھا باب

پھولوں کی سیج میں کانٹے

پانچواں باب

نخل تمنا کی بارآوری
محبوبہ کی عزت میں چار چاند
بارآوری کے انداز
صبح کیوقت طبیعت کی ناسازی
تختہ بلورین کی گرانی
رحم کی حرکت سے ایام کا تعین
نہرلبن کی پیدائش
مہد اولین میں بچہ کی حرکت
معصوم بچے کی پہلی شوخی
نوعمر ماں کے لئے فال نیک
حریم حسن کے بیرونی حصوں میں خارش
حور حریر سینہ کو نئی تکلیف
غنچہ دہن سے شبنم کے قطرے
نوعمر ماں کے لئے فال نیک
تشنج اور غشی کی شکایت
مثانہ کی کمزوری
تکالیف کے البم میں چند اور
تصویریں۔ طبیعت کا دائرہ
اعتدال سے تجاوز۔

استقرار حمل کی کیفیت
جوہر زندگی میں جرائم زندگانی
استقرار حمل کیلئے لازمی امر
استقرار حمل کا بہترین زمانہ

چھٹا باب

نخل بارآور کی نگہداشت
محبوبہ کی نازبرداری
لطف اندوزیوں سے اجتناب
معصوم ہستی خواہشات
نفسانی کے نہالچہ پر۔
فردوس گوش اور جنت نگاہ
بارآور سرو رواں کے لئے لباس
حریم حسن کا غسل
سرو رواں کی نقل و حرکت
راحت و آرام کی ضرورت
غذا میں احتیاط۔ بسوء ہضمی
کی خرابیاں۔ مکان کی صفائی
بغیر تکلیف کے وضع حمل
نخل تمنا کی پامالی
شاخ تمنا کی نئی کونپل
نخل تمنا قطع ہونے کے آثار

اسقاط میں آخری چارہ جوئی
آغوش رحم میں معصوم ہستی کی قبر
اسقاط کے بعد ضروری ہدایتیں
طلسم مصفا توڑنے کیلئے لوح طلسمی

ساتواں باب

ازدواجی زندگی کا ثمرہ نورس
اس باب میں زمانہ حمل کی
احتیاطیں اور بچے کی پیدائش
وغیرہ کے لئے ضروری ہدایات ہیں

آٹھواں باب

زنجیر فرائض میں نئی کڑیاں
کچا ساتھ
مست شباب کے ہونٹوں پر تبسم
شریک زندگی کی دلنوازی
مست شباب کے لئے آغوش شوق
ایام رضاعت میں گلشن جمال کی گلچینی
نخل تمنا کی قبل از وقت دوبارہ
بارآوری۔ نہر لبن سے شیرخوار
کی محرومی۔ دودھ چھڑانا کب ضروری ہے
زمانہ رضاعت میں گلگونی
لطف اندوزی کا اثر صحت جسمانی پر

نسائیت کے زندہ درگور مجسمے
محبوبہ کا جسم نازنیں گلشن رعنائی
کی خوشنما کلیاں۔ اس باب میں
اسکے بعد اولاد کی کثرت سے
باز رہنے کی مختلف تدابیر ہیں۔

نواں باب

۲۴ مضامین ہیں جن سے چند گلشن
ازدواج میں عروس بہار
عورت میں شان الوہیت
بادہ محبت ساغر نسائیت میں۔
عورت عین محبت ہے۔ عورت کی
تسخیر کا فن۔ شریک زندگی پر اعتماد
زن مریدی کی لعنت۔ سخت
کلامی کی باد سموم۔ طعن و تشنیع
کے تیر۔ نشہ شباب میں خلوت گزینی
حسن عریاں کا نظارہ پیہم

دسواں باب

ازدواجی زندگی کے چند پوشیدہ
۲۰ مضامین ہیں جن سے چند مردوں
کی مخصوص بیماریاں۔ غیر فطری
اخراج کے اسباب۔ سرعت

آپ کی دعا کیوں نہیں قبول ہوتی؟

اس لئے کہ آپ دعا مانگنے کے طریقوں سے ناواقف ہیں۔ اس لئے کہ آپ خدا اور اس کے رسول کے بتائے ہوئے طریقوں کے مطابق دعا نہیں مانگتے اس لئے کہ آپ کو فضیلت دعا کا حال نہیں معلوم اور قبولیت دعا کے اوقات سے بھی آپ کو واقفیت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی دعائیں اب تک زیادہ بے اثر رہی ہیں۔

لہذا ضرورت ہے کہ آپ پہلے دعا مانگنے اور مرادیں پوری ہونے کے طریقے معلوم کیجئے۔ اور خدا اور اس کے پیارے رسول کے بتائے ہوئے طریقوں کے مطابق دعا مانگئے۔ اور پھر دیکھئے کہ اگر آپ بے اولاد ہیں تو صاحب اولاد ہو جائیں گے۔ اگر آپ کو افلاس نے گھیر لیا ہے تو آپ کا افلاس دور ہو جائے گا۔ اگر آپ مقدمات کی وجہ سے پریشان ہیں تو آپ کی پریشانیاں بھی رفع ہو جائیں گی۔ غرضکہ آپ کی

ہر مراد کی کنجی

قرآنی دعائیں ہیں

جسمیں دعا مانگنے اور مرادیں حاصل ہونے کے تمام طریقے کا
گئے ہیں۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ اگر آپ قرآنی دعائ
تو آپ کی دعا کی مقبولیت یقینی ہے۔ کہ
چھپائی اعلیٰ درجہ کی کاغذ

دہلی کا سب سے سستا مصور رسالہ

پیشوا

جو اسلامی مسئلے بیان کرنے میں پورا عالم، اسلامی اور ملکی تاریخ بیان کرنے میں مستند مورخ، قومی و ملکی معاملات پر بحث کرنے میں آزاد رہنما، اسلامی تصوف کی تشریح کرنے میں پورا صوفی، عورتوں اور بچوں کی تربیت کے لئے مکمل استانی، بے روزگاروں کے لئے کم سرمایہ سے نفع بخش روزگار بتانے والا ماہر تجارت، اور دوسرے بہت سے مفید ادبی اور اصلاحی مضامین کا دلچسپ مجموعہ، چار صفحوں کی آرٹ پیپر پر خوشنما رنگین تصاویر، بڑی تقطیع کے پچاس صفحے، سفید ولایتی چکنا کاغذ ہر انگریزی مہینہ کی آٹھ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔ پرچہ میں مستقل مضامین حسب ذیل ہیں۔

نمبر شمار	عنوان	صفحات	اسمائے مضمون نگار	خلاصہ
۱	نکات قرآنی	۲	حضرت مولانا [illegible]	کلام الٰہی کی تفسیر مسلسل
۲	پیارے نبی کی پیاری باتیں	۳	مولانا عابد القادری صاحب	فخر کائنات محمدؐ کے حکیمانہ اقوال مع ترجمہ
۳	شرح مثنوی	۴	مولانا سید عطا [illegible]	حضرت مولانا روم کی مثنوی کی شرح
۴	بادہ خیام کا جام	۵	جناب [illegible] سعید احمد صاحب	حکیم عمر خیام کی رباعیات کا ترجمہ نظم و نثر میں
۵	تصویرات	۶ و ۷	عزیز حسن بقائی	اخلاقی مضامین الہامی اردو میں
۶	مذہبی معلومات	۸ تا ۱۱	جناب عبدالرزاق صاحب	اصلاحی اور مذہبی مضامین
۷	مشاہیر اسلام	۱۲ و ۱۳	عزیز حسن بقائی	تذکرہ صحابہ کرام و بزرگان اسلام
۸	رسائل کا عطر	۱۴ تا ۱۷	"	ہندوستان کے بہترین ادبی اور مذہبی رسائل کا عطر
۹	تاریخ وطن	۱۸ و ۱۹	عزیز حسن بقائی	ہندوستان کی تاریخ کے اہم واقعات
۱۰	دینیات دستور	۲۰	جناب سراج حسن خاں صاحب	مسلمان عورتوں کا اصلاحی پروگرام
۱۱	جاندار کھلونے	۲۱	"	مسلمان بچوں کے لئے بہترین ہدایات
۱۲	ذرائع معاش	۲۲	عزیز حسن بقائی	کم سرمایہ دار مسلمانوں کیلئے وسائل معاش
۱۳	افسانہ	۲۳ و ۲۴	جناب [illegible] صابر [illegible] صاحب	اصلاح معاشرت پر بہترین نصائح
۱۴	[illegible]	[illegible]	جناب [illegible] صاحب	[illegible] کی باتیں
۱۵	[illegible]	[illegible]	عزیز حسن بقائی	حالات حاضرہ پر آزادانہ رائے
۱۶	کارٹون	۳۵	مسٹر [illegible] خان آرٹسٹ	ملکی معاملات پر دلچسپ کارٹون

یہ سب مضامین اگر کتابی صورت میں جمع کئے جائیں تو دو سو صفحات کے قریب ہوتے ہیں۔ صرف دس پیسے ماہوار میں اتنا سستا اور ایسا مفید مذہبی خزانہ ملتا ہے جو بالکل مفت ہے۔ نمونہ اس پرچہ کا مفت نہیں ملیگا۔ صرف ۲ ٹکٹ [illegible] بھیجئے۔

چندہ سالانہ ڈیڑھ روپیہ

المشتہر: منیجر رسالہ پیشوا پوسٹ بکس نمبر ۱۰۵ دہلی